دارالمطالعہ قرآن اکیڈمی
17-8-04
ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

یادگار ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی ڈاکٹر اسرار احمد

مدیر مسئول حافظ عاکف سعید

نائب مدیر حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی ۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حافظ عاطف وحید

جلد ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۵ھ ۔ اگست ۲۰۰۴ء شمارہ ۸

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ ۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے مرتب کردہ ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' تحریک رجوع الی القرآن اور فریضۂ اقامتِ دین کی جدّوجہد کی بنیاد اور اساس کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب نے متعدد بار اس منتخب نصاب کے مفصل اور مختصر درس دیئے ہیں۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دَور میں ٹی وی پروگرام ''الہدیٰ'' میں بھی اسی منتخب نصاب کے دروس نے ایک طرف دعوت رجوع الی القرآن کو ملک کے طول وعرض میں متعارف کرادیا تھا اور دوسری طرف مغرب زدہ طبقے کی نیندیں حرام کردی تھیں اور اس طبقے کی خواتین اس قرآنی پروگرام کے آگے بند باندھنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئی تھیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ سلسلۂ دروس گزشتہ آٹھ برسوں سے حکمت قرآن کے صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا آخری اور چھٹا حصہ ''اُمّ المُسبِّحات سورۃ الحدید'' پر مشتمل ہے' جو اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے چند برس قبل قرآن آڈیٹوریم میں سورۃ الحدید کا درس بیس نشستوں میں مکمل کیا تھا۔ زیر نظر شمارے میں اس سلسلے کی سولھویں قسط شامل اشاعت کی جارہی ہے۔ اس طرح مزید چار اقساط کی اشاعت کے بعد یہ سلسلہ ان شاء اللہ العزیز تکمیل پذیر ہوجائے گا۔

زیر نظر شمارے کا ایک اہم مضمون ''اخلاقِ نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط اور علامت'' ہے جو استاذ مکرم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب علیہ الرحمہ کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں حافظ صاحب مرحوم نے سیرت طیبہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انوارِ نبوت ورسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لئے آخر جزیرۃ العرب ہی کو کیوں منتخب فرمایا اور باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر اہل عرب ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا مرکز ومنبع بنانے کے لئے چن لیا؟

انسانی معاشرہ خاندانوں سے مل کر وجود میں آتا ہے اور مسلمان معاشرے کی اصلاح میں خاندان کی اصلاح وتربیت کو بنیادی مقام حاصل ہے۔ لہٰذا ہمارے دین نے والدین پر اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ اس ضمن میں سید وصی مظہر ندوی صاحب کا مضمون ''اولاد کے حقوق' اسلام کی نظر میں'' شامل اشاعت کیا گیا ہے' جو مختصر ہونے کے باوجود موضوع زیر بحث کے جملہ پہلوؤں کا بڑی حد تک احاطہ کرتا ہے۔

مزید برآں سید قاسم محمود صاحب کا سلسلہ 'نباتات قرآن' پروفیسر محمد یونس جنجوعہ صاحب کا درسِ حدیث اور تعارف وتبصرۂ کتب اور عبدالرشید عراقی صاحب کا سیرت وسوانح...... یہ سب کچھ ایک ہی شمارے میں یکجا کر کے ہم نے گویا کوزے میں دریا بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اپنے قارئین کی آراء کا انتظار ہے کہ انہوں نے حکمت قرآن کا تازہ شمارہ کیسا پایا اور آئندہ شمارہ مزید بہتر بنانے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں!

منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت

اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید

(۱۶)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝﴾ (الحدید:۲۵)

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ (الصف:۹)

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾ (الصف:۱۴) ..... صدق اللّٰہ العظیم

سورۃ الحدید اور سورۃ الصّف کی دو آیات کا تقابلی مطالعہ

سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ پر ہماری گفتگو جاری تھی: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا' بینات (معجزات) کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب بھی نازل

فرمائی اور میزان (شریعت) بھی اتاری (نظامِ حقوق وفرائض کا متوازن نظام اتارا) تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوں''۔ وہ نظام بالفعل برپا کیا جائے' قائم کیا جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے اس آیہ مبارکہ کے اس حصے کا سورۃ الصف کی آیت ۹ سے ایک تقابلی مطالعہ کرلیا جائے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾

سورۃ الصف کی یہ آیت اس سورت کی مرکزی آیت اور اس کا عمود ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تین مرتبہ بالکل انہی الفاظ میں آیا ہے' سوائے اس کے کہ ایک مقام پر صرف آخری حصہ ذرا مختلف ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ یہ الفاظ قرآن حکیم میں تین دفعہ آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳' سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورۃ الصف کی آیت ۹ انہی الفاظ پر مشتمل ہے۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں آیت کے اختتام پر ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ ہیں' جبکہ سورۃ الفتح میں ﴿وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ کے الفاظ پر آیت ختم ہوتی ہے۔ تقابلی مطالعہ اس اعتبار سے کرنا ہے کہ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں تمام رسولوں کے ساتھ تین چیزوں کا ذکر کیا گیا: ﴿اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ اور اس سے پہلے ﴿بِالْبَیِّنٰتِ﴾ جبکہ حضور ﷺ کے بیان میں صرف دو چیزوں کا ذکر ہوا: ﴿الْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کا اصل معجزہ قرآن حکیم ہے۔

الہدیٰ سے مراد قرآن ہے۔ یہ هُدًی لِّلنَّاسِ ہے' هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے' الھُدیٰ (The Guidance) ہے' جس میں ہدایتِ خداوندی مکمل ہو چکی' اپنے اتمام کو پہنچ چکی' درجۂ تکمیل کو پہنچ چکی ـــــ اور حضور ﷺ کا معجزہ بھی یہی ہے۔ حضور ﷺ کا معجزہ یدِ بیضا نہیں ہے' عصائے موسیٰؑ کی شکل میں نہیں ہے' چٹان سے کسی اونٹنی کے برآمد ہو جانے کی صورت میں نہیں ہے' بلکہ حضور ﷺ کا معجزہ قرآن ہے۔ ﴿یٰسٓ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۝﴾ ''قرآن حکیم کی قسم ہے (یہ حکمت بھرا قرآن

گواہ ہے اس پر کہ) آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں‘‘۔ ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ﴾ ’’قرآن مجید کی قسم ہے۔‘‘ یہ باعظمت قرآن گواہ ہے آپؐ کی رسالت پر۔ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ﴾ ’’قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی‘‘۔ یہ قرآن جو ذکر والا ہے‘ نصیحت والا ہے‘ یہی آپؐ کی رسالت کا ثبوت ہے۔ تو یہ جان لیجئے کہ قرآن حکیم صرف کتاب نہیں ہے‘ بلکہ یہ معجزہ + کتاب = الہدیٰ ہے۔ اور وہ جو میزانِ شریعت چلی آ رہی تھی وہ اپنی تکمیل کو پہنچ گئی ہے دینِ حق کی شکل میں۔

میری کتاب ’’نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت‘‘ تین مقالات پر مشتمل ہے‘ درمیانی مقالہ کا موضوع یہی ہے کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا ہے؟ اور اس میں تفصیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے انسانی ذہن ارتقائی منازل طے کرتا ہے اسی طرح نوع انسانی کا فکر اور ذہن بھی بحیثیتِ مجموعی ان ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان اپنے ذہنی ارتقاء کے اعتبار سے بلوغ کو پہنچ گیا تو محمد رسول اللہ ﷺ پر ’’الہدیٰ‘‘ کا اتمام ہو گیا۔ اسی طریقے سے تمدنِ انسانی کا بھی ارتقاء ہوا ہے۔ کبھی انسان غاروں میں رہتا تھا‘ کوئی اجتماعی نظام تھا ہی نہیں۔ پھر کوئی قبائلی نظام قائم ہوا‘ پھر کوئی ریاستی نظام قائم ہوا‘ پھر بڑی بڑی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ اور اب آ کر پورا نظامِ زندگی جس طور سے اجتماعیت کی گرفت میں آ چکا ہے‘ تو اگر وہ نظام صحیح ہو تو تمام افراد کا معاملہ بھی بہتر ہو جائے گا‘ اور نظام ہی غلط ہو تو ظاہر بات ہے کہ معاشرہ تلپٹ ہو کر رہ جائے گا۔ تو جب وہ تمدن اس سطح کو پہنچ گیا کہ روم اور فارس جیسی بڑی بڑی عظیم مملکتیں (Empires) قائم ہو گئیں تو اس وقت حضور ﷺ کو عدل وقسط پر مبنی ایک کامل نظامِ اجتماعی (Politico-Socio-Economic system) دے کر بھیجا گیا‘ جسے آپ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل قائم کر کے دکھایا اور اسے پوری دنیا میں قائم کرنے کی ذمہ داری اُمت کے سپرد فرمائی۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب تک اسے قائم کر کے نہ دکھا دیا جائے‘ یہ نظام دنیا پر حجت نہیں بن سکتا۔

شہادت علی الناس پر ان دروس میں بھی گفتگو ہوئی ہے کہ شہادت زبان سے بھی

دی جاتی ہے' دل سے بھی اور عمل سے بھی۔

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق!

ہم گواہی دیتے ہیں: نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ ہمیں یہ گواہی اپنے عمل سے بھی دینی چاہئے کہ واقعۃً ہم اللہ کو اپنا الٰہ' معبود اور حاکمِ مطلق مانتے ہیں اور محمد ﷺ کو واقعۃً اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ پھر یہ گواہی انفرادی طور پر ہی نہیں' اجتماعی طور پر بھی مطلوب ہے' اور یہ گواہی اُس وقت قائم ہوگی جب کہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جائے۔ ورنہ کہا جائے گا کہ یہ محض خیالی جنت (Eutopia) ہے' باتیں تو بڑی اچھی ہیں' لیکن قابلِ عمل نہیں ہیں' انہونی سی باتیں ہیں۔ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" کہنا تو بڑا آسان ہے' لیکن کیا واقعۃً کہیں ایسا ہوسکتا ہے؟ جی ہاں! اس کا عملی نقشہ اگر دیکھنا ہو تو ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دیکھ لیجئے۔ ایسا نہیں ہے کہ بس کوئی شاعری کی گئی ہو' معاذ اللہ ـــــ بلکہ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھایا جس میں ہر نوع سے توازن ہے۔ عورتوں کو حقوق دیئے گئے ہیں' لیکن وہ حقوق اس طرح کے نہیں ہیں کہ خاندانی نظام درہم برہم ہو جائے۔ عوام کو حقوق دیئے ہیں' وہ خلیفۃ المسلمین کو دورانِ خطبہ ٹوک کر پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کُرتا آپ نے کہاں سے بنایا ہے؟ لیکن وہ آزادی اس طرح کی بھی نہیں ہے کہ وہ نظام ہی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح جو صاحبِ مال ہے اس کے اپنے حقوق ہیں' لیکن مزدور کا اپنا حق ہے۔ صاحبِ مال کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ سود کی بنیاد پر اپنے مال میں اضافہ کرنے لگے اور ارتکازِ زر کا مرتکب ہو۔ اسلام کے نزدیک یہ سب سے بڑی حرام شے ہے۔ یہ نظام ہے جو دینِ حق کی شکل میں محمد عربی ﷺ کو دیا گیا۔

ہم تقابل کر رہے تھے کہ جہاں عمومی قانون بیان ہوا' وہاں تین چیزیں مذکور ہوئیں: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ خصوصی ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ اس لئے کہ الہدیٰ قرآن ہے' قرآن ہی معجزہ بھی ہے

اور قرآن ہی الکتاب بھی ہے۔ اور وہ نظامِ عدلِ اجتماعی دینِ حق کی شکل میں کامل نظام کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا۔ تو کس لئے بھیجا حضور کو؟ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''تا کہ اس کو کل جنسِ دین پر غالب کر دے''۔ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب کر کے دکھائے۔ یہ نظام کسی اور نظام کے تابع رہے گا تو پھر ظاہر کیسے ہوگا؟ اگر یہ ملوکیت کے تابع ہو گیا' سرمایہ داری کے تابع ہو گیا یا کسی اور نظام کے تابع ہو گیا تو پھر وہ نظام نہیں' مذہب بن جائے گا' جو عقائد' مراسم عبودیت اور سماجی رسومات کا مجموعہ ہوگا۔ جیسا کہ خلافت راشدہ کے بعد تدریجاً جب خلافت کا نظام ختم ہوا اور ملوکیت آئی' جاگیرداری آئی' سرمایہ داری آئی' تو دین سکڑ کر مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ اب یہ صرف عقائد اور نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہو گیا۔ اس کے علاوہ کچھ ذکر اور مراقبوں کے حلقے اس میں راہ پا گئے۔ باقی رہا نظام' وہ تو بادشاہوں کا تھا۔ محلات ان کے بننے لگے۔ بادشاہ کی محبوب بیوی کا انتقال ہوا تو کروڑوں روپے سے تاج محل بن گیا۔ بادشاہ کو محل چاہئے' الحمرا بن گیا۔ بادشاہ کے لئے تو بڑا شاندار توپ کاپی جیسا محل ہونا چاہئے۔ استنبول میں جا کر دیکھئے کتنا عظیم الشان محل بنایا ہے۔ کہاں عمر فاروق ﷺ تھے جو حجرے میں رہتے تھے' لیکن ان کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کے اندر لرزہ طاری ہوتا تھا' کہاں یہ عالم کہ عیاشیاں ہیں' ایوان سجا رکھے ہیں' لیکن دنیا کے اندر ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ تو بہر حال اس چیز کو سمجھئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت یہ ہے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تا کہ وہ اس دین کو غالب کریں' قائم کریں' نافذ کریں اور پورے نظامِ زندگی پر اسلام چھا جائے' اسلام غالب آ جائے' اسلام قائم ہو جائے۔ زندگی کا کوئی جزو' کوئی پہلو' اس سے خارج اور آزاد نہ رہ جائے۔ وہی بات یہاں کہی گئی: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

انزالِ حدید کی غرض و غایت

اب یہ مقصد پورا کیسے ہوگا؟ فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی

اتارا ہے' ﴿ فِيهِ بَاْسٌ شَدِيدٌ ﴾ ''جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔''باس'' کا ترجمہ بعض حضرات صرف قوت کر دیتے ہیں کہ ''اس میں بڑی طاقت ہے'' لیکن اس کا حقیقی ترجمہ ''اسلحہ کی قوت'' ہے۔اسی لوہے سے تلوار' نیزہ' ڈھال اور دیگر سامانِ جنگ تیار ہوتا ہے' ''بأساء'' جب جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد فقر و فاقہ' بھوک اور تنگی ہوتا ہے لیکن جب ''الباس'' آتا ہے تو یہ جنگ ہی کے معنی میں آتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کے درس دوم (آیۃ البر) میں یہ دونوں ہی الفاظ آئے ہیں —— فرمایا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور صبر کرنے والے تنگی و مصیبت کے وقت میں اور (حق و باطل کی) جنگ میں۔''

چنانچہ ''اَلْبَاْسَاءِ'' سے تنگی' فاقہ' بھوک' زخم وغیرہ کی تکلیف یا کوئی مصیبت وغیرہ مراد ہے' جبکہ ''الباس'' جنگ ہے۔انسان کا اصل امتحان تو ''حِيْنَ الْبَاْسِ'' یعنی جنگ کے وقت ہی ہوتا ہے جہاں جان کے لالے پڑ جائیں' جہاں جان کی بازی کھیلنی پڑے۔ جو وہاں پر صبر کا مظاہرہ کر سکیں وہ ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو واقعۃً (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعۃً متقی ہیں۔'' یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے ان الفاظ کا مطالعہ کیجئے: ﴿ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ ﴾ ''اس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے''۔ ﴿ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ ''اور لوگوں کے لئے دوسری منفعتیں بھی ہیں''۔آج کل تو اس اعتبار سے ہمارے نزدیک لوہے کی اہمیت کم ہوگئی ہے' ورنہ توا' پرات' چمٹا' پھونکنی سب لوہے سے ہی بنتی تھیں۔اب ہمارے زیر استعمال اشیاء میں لوہا اس طرح سے نمایاں نظر نہیں آتا' لیکن بہرحال اس میں لوگوں کے لئے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ ﴾ ''اور تاکہ اللہ یہ ظاہر کردے''۔''لِيَعْلَمَ'' کا لفظی ترجمہ ہے ''تاکہ اللہ یہ جان لے'' لیکن ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں ''تاکہ اللہ دکھا دے'

ظاہر کر دے''۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے' اللہ کو معلوم ہے کون کتنے پانی میں ہے' لیکن اللہ لوگوں کو دکھا دینا چاہتا ہے اور یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔ ﴿مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''کون ہے وہ جو غیب کے باوجود اللہ کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ دین اللہ کا ہے جس کے قیام کی جدوجہد کرنا ہے۔ حاکمیت اللہ کے لئے ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں ہم دو مرتبہ یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اسی کی بادشاہت ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی''۔ پھر ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ ''وہی غالب حکمت والا ہے''۔ وہ العزیز بھی ہے' الحکیم بھی ہے۔ بادشاہ حقیقی وہ ہے' حکم اس کا چلنا چاہئے۔ لہٰذا جو لوگ اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے حکم کو نافذ کرتے ہیں وہ اللہ کے مددگار ہیں۔ اور اللہ کے اس دین کو عملاً قائم کرنا فرض منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا اور تمام رسولوں کا' تاکہ دنیا میں عدل قائم کریں۔ اس کے لئے یہاں الفاظ آئے: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ ''تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ سورۃ الشوریٰ میں واحد کے صیغے میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے فرمایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں''۔ اور سورۃ التوبۃ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں تین مرتبہ یہ الفاظ آ گئے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو گویا کہ جو بھی لوہے کی طاقت لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کی نصرت کے لئے میدان میں آ گئے وہ ہیں اللہ کے بھی مددگار اور رسولؐ کے بھی مددگار۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب

یہ وہ حقیقت ہے جس کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ اسے قرآن نے عریاں انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو حق بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں' کوئی رکاوٹ نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب:۵۳) ''اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا''۔ عام آدمی سمجھے گا یہ بات کہنے کی نہیں ہے' اگر ہے بھی تو دل میں رکھو' اس کو زبان پر نہ لاؤ۔ لیکن یہاں اچھی طرح

بات سمجھا دی گئی ہے کہ دنیا میں نظامِ عدل اجتماعی کو قائم کرنے کا طریق کار کیا ہے؟ اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ آپؐ کو جو الہدیٰ دی گئی ہے' جو کتاب ہدایت بھی ہے اور معجزہ بھی' اس کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دیجئے۔ اسی ہدایت کی لوگوں میں تبلیغ کیجئے۔ اس پیغام ربانی کو عام کیجئے' لوگوں کو ذہناً اور قلباً اس پر مطمئن کیجئے' اس کے مضمرات کو کھول کر بیان کیجئے۔ ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل:٤٤) ''(اے محمدؐ) ہم نے آپ پر یہ ذکر نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس تعلیم کی تشریح اور وضاحت کریں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے''۔ یہ سارے کام کیجئے۔ جیسا کہ سورۃ الجمعہ میں ہم نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہج عمل کے عناصر چہارگانہ پڑھ چکے ہیں: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ـــــ یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا' ان کا تزکیہ کرنا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دینا۔

ہمیں پانچویں جماعت میں سب سے پہلا سائنسی تجربہ غالباً یہ کرایا جاتا تھا کہ لوہ چون اور لکڑی کے برادے کو علیحدہ کیسے کیا جائے گا۔ ہاتھ میں مقناطیس لے کر اس مکسچر پر پھیریئے تو لوہ چون اس کے ساتھ چمٹتا چلا جائے گا اور برادہ باقی رہ جائے گا۔ بالکل یہی معاملہ اس ''الہدیٰ'' کا ہے۔ یہ ہدایت کی طرف کھینچنے والا مقناطیس ہے۔ اور یہ اسی کو اپنی طرف کھینچے گا جس کی اپنی فطرت کے اندر کسی نہ کسی درجے میں ہدایت موجود ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو جیسے برادہ میگنٹ کے ساتھ نہیں چمٹتا اسی طرح اس الہدیٰ کے ساتھ وہ ابوجہل نہیں چمٹے گا جن کی فطرت مسخ ہو چکی۔ ابولہب نہیں چمٹے گا چاہے وہ حقیقی چچا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک دیوار بیچ کا پڑوسی ہے۔ اس کا حال تو یہ تھا کہ اگر حضورؐ کے گھر میں ہنڈیا پک رہی ہے تو اس کے اندر بھی اس کے گھر سے غلاظت پھینکی جا رہی ہے' اور یہ سگا چچا کر رہا تھا جو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے' لیکن عناد' دشمنی' شقاق اور حسد کے جذبات کے زیر اثر وہ اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ اس حوالے سے جان لیجئے کہ جس کے اندر صلاحیت ہے وہی اس مقناطیس کے ذریعے کھنچے گا۔ جو شے حرارت کے لئے اچھے

موصل (کنڈکٹر) کا درجہ رکھتی ہے' اسی میں حرارت سرایت کرے گی۔ اسی طرح جو بجلی کے لئے اچھا موصل ہے' اسی میں سے الیکٹرک کرنٹ گزر سکے گا۔ لیکن بہرحال آپ اس میگنٹ کو پھیلائیں۔ جتنا بڑا معاشرہ ہے اسی پیمانے پر پھیلائیں گے' تب ہی اس میں جو بھی سلیم الفطرت لوگ ہیں وہ چمٹ کر آئیں گے۔ اگر آپ صرف اپنی کُلھیا میں گڑ پھوڑتے رہیں گے' تو آس پاس کے لوگوں کو کیا پتا چلے گا؟ لہٰذا آپ اپنے میدانِ کار کی وسعت کے مطابق اس قرآن کی دعوت کو پھیلایئے' عام کیجئے۔

پھر یہ کہ یہ دعوتِ قرآنی وقت کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ آپ صرف وعظ کہہ رہے ہوں اور آپ کے معاشرے کا جو ذہین عنصر ہے وہ اس کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ آپ جو دعوت دے رہے ہیں اس کے لئے دلائل اور براہین ہونے چاہئیں۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵) ''اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ' اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو''۔ قرآن معجزہ بھی ہے' قرآن برہان بھی ہے' قرآن میں حکمت بھی ہے' ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰی اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل:۳۹) ''یہ ہیں وہ حکمت کی باتیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں''۔ آپ اپنے معاشرے کے ذہین عناصر کو متاثر کیجئے' تعلیم یافتہ طبقے میں اسے عام کیجئے۔ قرآن کے وعظ و نصیحت کے ذریعے سے عوام الناس کو کھینچئے۔

بہرحال جن کے اندر بھی خیر اور بھلائی ہے' صلاحیت ہے' وہ کھنچے چلے آئیں گے۔ لیکن جن کے اندر صلاحیت نہیں ہے' وہ نہیں آئیں گے۔ اور جن کے پیش نظر مفادات ہیں وہ بات کو حق سمجھ کر بھی نہیں آئیں گے' جیسے کہ میں پہلے مثال دے چکا ہوں کہ یہود کے علماء سے بڑھ کر کون تھا جو حضور ﷺ کو پہچان سکتا تھا؟ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے: ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۴۶) ''وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں''۔ لیکن انہوں نے آپؐ کو ماننا

کیوں نہیں؟ اس لئے کہ ان کی چودھراہٹیں تھیں' ان کی مسندیں تھیں' ان کی حیثیتیں تھیں' لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے۔ لوگ آ آ کر ان سے فتویٰ مانگتے تھے' ان سے مسئلے پوچھتے تھے۔ وہ کتابِ الٰہی کے عالم تھے۔ لہٰذا اب اگر وہ حضور ﷺ کو مان لیتے' تو ان کی حیثیت ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ نہیں مانا۔ اس حوالے سے جان لیجئے کہ مراعات یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ' جس کے موجودہ نظامِ باطل کے ساتھ مفادات وابستہ ہیں' اس دعوت پر کان نہیں دھرے گا ——— بلکہ ان کی تو کوشش یہ ہوگی کہ انقلابِ اسلامی کا راستہ روکو! نظام کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے!! ان کی تو آپس میں جتھہ بندیاں بنیں گی کہ آؤ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ اب ایک ہی راستہ ہے کہ جو سلیم الفطرت لوگ آ گئے ہیں' ان کو جمع کیا جائے اور ان کا تزکیہ کیا جائے۔ ان کی نیتیں بھی خالص ہو جائیں' کوئی کھوٹ نہ رہے۔ ان کی شخصیتیں نکھر جائیں۔ لوگوں کو ان کے کردار کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے۔ یہ آزمائشوں میں سے گزریں' امتحانوں میں سے نکلیں' اور کندن بن جائیں۔ پھر ان کو منظم کرو' آرگنائز کرو اور ان کو بٹ کر کوڑا بناؤ۔ جیسے مختلف دھاگوں اور رسیوں کو بٹ دیں تو کوڑا بنتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ دھاگا کمزور ہوتا ہے' اسے جو چاہے توڑ سکتا ہے۔ لیکن دھاگوں کو بٹ کر رسیاں اور رسیوں کو باہم بٹ کر جو کوڑا بنایا جاتا ہے' یہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ جو کوڑا بنایا ہے' اب یہ کوڑا باطل کے سر پر دے مارو۔ یہ ہے اصل میں فلسفہ انقلاب۔ اس کے لئے ظاہر بات ہے ٹکرانا پڑے گا۔ اور ٹکرانے کے لئے جب میدان میں آؤ گے تو یَقْتُلُوْنَ کے ساتھ یُقْتَلُوْنَ بھی ہو گا۔ جہاں قتل کرو گے وہاں خود بھی قتل ہو گے۔ تمہیں کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی کہ تم قتل نہیں ہو گے۔ یہ گارنٹی تو صحابہ کرام ؓ کو بھی نہیں دی گئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کوئی لوہے کا جسم نہیں دیا گیا تھا کہ برچھا اس کے پار نہیں ہو گا۔ چنانچہ وحشی کی برچھی حضرت حمزہؓ کو ناف کے قریب لگی اور جسم کے آر پار ہو گئی۔ جب صحابہ کرام ؓ کو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی تو پھر اور کون ہو گا جسے کوئی ضمانت حاصل ہو یا اللہ کی طرف

سے انشورنس ہو؟ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرما دیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقٰتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ؕ﴾ (التوبۃ: ۱۱۱)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تو اہل ایمان سے ان کے مال اور ان کی جانیں جنت کے عوض خرید لی ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔''

غزوۂ بدر میں ستر قرشی مارے گئے اور صحابہ ﷺ میں سے صرف تیرہ شہید ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک زخمی تھے جو مدینہ واپسی پر راستے میں شہید ہو گئے۔ لیکن غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ایک غلطی کی وجہ سے پانسہ بالکل پلٹ گیا اور ستر مسلمان شہید ہو گئے۔ تو ''يُقْتَلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ'' کا معاملہ تو کرنا پڑے گا' انقلاب اس کے بغیر نہیں آتا۔ انقلاب کے لئے جان بھی دینی پڑے گی اور اس کے لئے طاقت کا استعمال بھی کرنا ہوگا۔

دین کے بعض حقائق کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے:

(۱) گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن!

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ یہ جو میری دنیا ہے کیا یہ تمہارے لئے سازگار ہے؟ (یعنی کیا اس کا موجودہ نظام تمہیں پسند ہے؟ تم اس پر مطمئن ہو؟) میں نے عرض کیا کہ نہیں' یہ میرے لئے سازگار نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ پھر اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دو!''

اور اس ''برہم زن!'' کا طریق کار کیا ہے؟ اسے اقبال نے اگلے شعر میں واضح کر دیا ہے

(۲) با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلا مرحلہ درویشی یعنی دعوت و تبلیغ کا ہوگا۔ گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینی ہوں گی۔ پتھراؤ کے جواب میں بھی پھول پیش کرنے ہوں گے۔ جو لوگ خون کے پیاسے ہیں

انہیں معاف کرنا ہوگا۔ جیسے کہ اہل طائف کی طرف سے شدید ترین اذیت رسانی کے بعد بھی نبی رحمت ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ اس لئے کہ یہ جانتے نہیں ہیں''۔ دعوت کے مرحلے میں تو گویا بدھ مت کے بھکشوؤں والی روش اختیار کرنی پڑے گی۔ دعوت کے اندر تو التجا بھی ہوتی ہے' لجاجت بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے بندو میری بات سنو! در در پر جا رہے ہیں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا' کسی نے کچھ کہہ دیا۔

رسول اللہ ﷺ طائف میں وہاں کے تینوں سرداروں سے ملے ہیں۔ ایک نے کہا: اچھا جی آپ کے سوا کوئی نہیں ملا تھا اللہ کو رسول بنانے کے لئے؟ نکل جاؤ یہاں سے! ایک نے کہا: جاؤ چلے جاؤ' میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ایک نے کہا: یا تو تم جھوٹے ہو یا سچے ہو' اگر جھوٹے ہو تو جھوٹے کو میں منہ نہیں لگاتا اور اگر سچے ہو تو میں کہیں گستاخی کر بیٹھوں گا۔ لہٰذا بہتر ہے تم روانہ ہی ہو جاؤ۔ ایسے ایسے زہر میں بجھے ہوئے جملے محمد رسول اللہ ﷺ کو سننے پڑے۔ اور پھر جب وہاں سے واپس روانہ ہوئے تو انہوں نے وہاں کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا' جنہوں نے محبوب ربُّ العالمین ﷺ پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈی کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اور اُس وقت صرف ایک ساتھی زید بن حارثہ ؓ آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ایک آدمی ایک طرف سے ہی ڈھال بن سکتا ہے۔ حضرت زید ؓ حضور ﷺ کو بچانے کے لئے' آپؐ کو cover کرنے کے لئے ایک طرف آتے تو اوباش دوسری اطراف سے پتھر مارتے۔ جسم اطہر لہولہان ہو رہا ہے۔ پاؤں میں آ کر خون جوتوں میں جم گیا ہے۔ پھر کچھ غشی سی طاری ہوگئی تو آپؐ بیٹھ گئے ہیں۔ اس پر ایک غنڈے نے ایک بغل میں ہاتھ ڈالا' دوسرے نے دوسری بغل میں' اور حضور ﷺ سے کہا کہ اٹھو' چلو! دعوت کے مرحلے میں۔ یہ نقشہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا ـــــ محبوب ربُّ العالمین ﷺ کا ـــــ سیّد الاوّلین والآخرین ﷺ کا ـــــ

رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج

(Climax) ہے۔شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپؐ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے' سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ـــــ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔''

اُس وقت ملک الجبال حاضر ہوتا ہے کہ اللہ نے مجھے بھیجا ہے' میں پہاڑوں پر مامور فرشتہ ہوں۔ آپؐ اگر حکم دیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو ٹکرا دوں جس کے مابین طائف کی یہ بستی ہے جس میں آپؐ کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔ فرمایا: نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔

اب بتائیے کون بدھ مت کا بھکشو درویشی میں اس سے آگے جائے گا؟ اور جبکہ اپنے ساتھی نگاہوں کے سامنے ذبح کیے جا رہے ہیں' حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا ذبح کی جا رہی ہیں' ان کے شوہر حضرت یاسر ؓ کو ابوجہل نے جس برے طریقے سے سرِعام ٹکڑے کر دیا' اس پر بھی آپؐ نے اہل ایمان کو مشتعل نہیں ہونے دیا۔ تشدد و تعذیب

کے وقت حضور ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو یہ فرماتے :((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃَ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' تمہارے وعدے کی جگہ اللہ کے ہاں جنت ہے'' ——— لیکن ساتھیوں میں سے کسی کو اجازت نہیں دی کہ ابوجہل کی تکہ بوٹی کر دے۔ اس لئے کہ ابھی مرحلہ درویشی کا ہے۔

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ابھی ذرا اپنے جذباتِ انتقام کو تھامے رکھو! ابھی مرحلہ Passive Resistance کا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیئے جائیں گے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ تمہیں اذنِ قتال ملے گا' تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ملے گی۔ لیکن ابھی اپنے ہاتھ باندھے رکھو! پھر وہ وقت آیا کہ اب تلواریں بھی ہیں' نیزے بھی ہیں' میدان میں آئے ہیں ﴿یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ﴾ کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس سارے process کو علامہ اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!!

پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ درویشی کی روش اختیار کرو' درویشی کی خو پختہ کرتے رہو۔ دعوت و تربیت کے مرحلے میں دعوت دیتے رہو' محنت کرتے رہو' تربیت اور تزکیہ کرتے رہو اور اس دوران تمام تکلیفیں اور مصیبتیں پورے صبر کے ساتھ جھیلو اور برداشت کرو۔ ساتھ ساتھ اپنی تنظیم پر توجہ دو' ساتھیوں کو منظم کرو ——— اور جب تعداد کے اعتبار سے اور کیفیت و کمیت دونوں اعتبارات سے تیار ہو جاؤ کہ سیرت بھی پختہ ہو چکی ہو' تربیت بھی ہو چکی ہو' تزکیہ بھی ہو چکا ہو' قول و فعل کا تضاد نہ رہا ہو' انسان کا ظاہر باطن ایک ہو چکا ہو' منظم ہو چکے ہوں' ایک امیر کی دعوت پر کھڑے ہو کر لبیک کہیں اور اپنی جانوں کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں' اور اگر روکنے کا حکم دیا جائے تو رک

جائیں تو پھر نظامِ باطل سے ٹکرا جائیں ع چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن! جب خود کو پختہ کر لو تو اب اپنے آپ کو سلطنت جم پر دے مارو! یہ ہے دو مصرعوں میں پورا طریق انقلاب۔

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں یہ پورا طریق انقلاب دوٹوک انداز میں بیان فرما دیا گیا ہے کہ ہم نے دلیل بھی اتار دی' بیّنہ بھی اتار دی' کتاب بھی نازل کر دی اور میزان بھی اتار دی۔ کتاب کی دعوت سے لوگ آپ کے قریب آ جائیں گے۔ لیکن اب ان کو منظم کر کے ایک طاقت بنانا ہے تا کہ نظام باطل سے ٹکرایا جائے۔ ایسے سرفروش اور ایسے جان فروش تیار کرنے ہیں کہ جو اپنے سر کی اور جان کی بازی کھیلنے کو تیار ہوں۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾

''اہل ایمان میں وہ جوان مرد ہیں کہ جو عہد انہوں نے اللہ سے کیا تھا وہ سچا کر دکھایا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور جو باقی ہیں وہ منتظر ہیں کہ کب باری آئے''۔

گویا ؎

وبالِ دوش ہے سرِ جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے!

تو یہ ہے وہ آیت مبارکہ جس کے بارے میں میں کہا کرتا ہوں کہ دنیا بھر کے انقلابی لٹریچر میں اس سے زیادہ عریاں انقلابی الفاظ کہیں نہیں ملتے! فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ ''اور ہم نے لوہا اتارا جس میں قوت ہے جنگ کی'' ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور لوگوں کے لئے کچھ اور فائدے بھی ہیں'' ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''اور تا کہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں وہ (صادق الایمان وفادار بندے) جو غیب میں رہتے ہوئے' اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں؟'' ایمان کا دعویٰ تو آسان ہے' مگر

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا!

محبوبیتِ الٰہی کا مقام

اس کے ساتھ سورۃ الصف کی یہ آیت جوڑ لیجئے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں (اپنے وہ بندے) جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر' گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

سورۃ الحدید اس اعتبار سے عجیب سورت ہے کہ اس میں لفظِ جہاد آیا نہ قتال' لیکن دونوں کے مضامین موجود ہیں۔ لفظ ''الحدید'' (لوہا) میں اسلحہ کا ذکر آ گیا۔ یہ اُمّ المسجات ہے اور کل مسجات کے سارے مضامین اس میں جمع ہیں۔ ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ کے الفاظ میں گویا واضح کر دیا گیا کہ اللہ کو تو محبت ان اہل ایمان سے ہے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں' غیب میں ہونے کے باوجود''۔

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

اللہ کو محبوب اپنے وہ بندے ہیں جو لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے میدان میں آتے ہیں۔ وہ نہیں کہ جو ع ''تو فقط اللہ ہو' اللہ ہو' اللہ ہو!'' کے مصداق اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ضربیں لگاتے جائیں اور ساری عمر ضربیں لگاتے ہوئے ہی گزار دیں۔ نہ زندگی میں باطل کے ساتھ کبھی پنجہ آزمائی کا موقع آئے نہ کبھی باطل کو للکارنے کا۔

اس طرزِ عمل کے بارے میں میں یہ حدیث بارہا سنا چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا۔ ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت تلپٹ کر دو۔'' قَالَ: فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهَا

عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ حضور ﷺ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار اس بستی میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنا وقت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کیا''۔ قَالَ :فَقَالَ :اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ ' فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ ''حضور ﷺ فرماتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الٹو اس بستی کو پہلے اس پر' پھر دوسروں پر۔ اس لئے کہ اس کے چہرے کا رنگ میری غیرت کی وجہ سے کبھی متغیر نہیں ہوا''۔ یہ بیٹھا اپنی ذاتی نیکی' ذاتی تقویٰ' ذاتی عبادت گزاری' تہجد گزاری اور مراقبوں میں منہمک رہا اور اس کے اردگرد باطل پروان چڑھتا رہا' پھیلتا رہا' اس کا بول بالا ہوتا رہا۔ شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور یہ لگا رہا اپنے اسی کام میں' تو یہ دوسروں سے زیادہ بڑا مجرم ہے۔ لہٰذا الٹو اس بستی کو پہلے اس پر پھر دوسروں پر۔

دوسری طرف اگر اپنی تربیت اور اپنا تزکیہ کئے بغیر میدان میں آ جاؤ تو وہی کچھ ہو گا جو آج جہاد کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس طرح جہاد بدنام بھی ہو گا اور فساد کی شکل اختیار کرے گا۔ کسی اجتماعیت میں نہ دعوت کا مرحلہ آیا' نہ تربیت اور تزکیہ کا' اور نہ ہی قول و فعل میں مطابقت پیدا کی گئی اور نکل کھڑے ہوئے کلاشنکوف لے کر جہاد کرنے کے لئے! چنانچہ اس جہاد کا دنیا میں مذاق اڑ رہا ہے اور جہاد بدنام ہو رہا ہے۔ اس طرح دین کی بنیادی اصطلاحات کو رسوا کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں سوائے فساد کے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔

موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا متبادل

محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقِ انقلاب پر میری پوری کتاب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' موجود ہے اور اس موضوع پر میرے اردو اور انگریزی خطابات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس بھی موجود ہیں۔ ان خطابات میں مَیں نے پوری تفصیل سے واضح کیا ہے کہ منہج انقلابِ نبوی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقِ انقلاب کیا ہے' اس کے مختلف مراحل کیا ہیں اور یہ کہ آج کے زمانے میں مسلح تصادم اور قتال کی متبادل کیا صورت ہے۔ آج

کے دَور میں قتال یک طرفہ (one way) بھی ہوسکتا ہے۔ یک طرفہ جنگ یہ ہوگی کہ آپ منکرات کے خلاف مظاہروں اور picketing کے لئے میدان میں نکل کھڑے ہوں اور اعلان کر دیں کہ جب تک ان منکرات کا خاتمہ نہیں ہوتا' ہم ٹیکس اور لگان نہیں دیں گے۔ یہ سودی نظام جو چل رہا ہے یہ حرام ہے' ہم اسے چلنے نہیں دیں گے!! اس پر قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آئیں گے اور آپ پر لاٹھیاں برسیں گی' گولیاں چلیں گی۔ اب اگر یہ مظاہرین ثابت قدم رہیں' جوابی کارروائی نہ کریں اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر رہیں تو بالآخر حکومت وقت کو ہار ماننا پڑے گی اور انقلاب آ جائے گا۔ ایران کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے کہ ایرانیوں نے تیس چالیس ہزار جانوں کی قربانی دی تو وہاں انقلاب آ گیا۔ کشمیر میں بھی چالیس ہزار جانیں دی جا چکی ہیں' لیکن وہاں ابھی اس کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ کہاں ایران جتنا بڑا ملک اور کہاں وہ کشمیر کا چھوٹا سا خطہ! اگرچہ اسے ''ایرانِ صغیر'' کہتے ہیں۔ بقول اقبال۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کشمیریوں کا جس طرح قتل عام ہو رہا ہے اس اعتبار سے یہ اعداد و شمار غلط نہیں ہو سکتے۔ لیکن چالیس ہزار جانیں جانے کے باوجود نتیجہ کچھ نہیں ـــــ جبکہ ایران میں اتنی تعداد میں جانیں دی گئیں تو بادشاہ کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس لئے کہ ایرانیوں کی جنگ یک طرفہ (one way) تھی۔ انہوں نے مارا کسی کو نہیں' خود مرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود بادشاہ کو اپنی فوج کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ یہ میرا تختہ اُلٹ دے گی۔ فوج بھی تو آخر عوام میں سے ہوتی ہے۔ یہ انہی کے بھائی بند اور بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ عوام کے خلاف ایک حد تک کارروائی کے بعد فوج جواب دے دیا کرتی تھی۔ یہاں پر بھی بھٹو صاحب کو فوج نے جواب دے دیا تھا کہ کب تک ہم لوگوں کو مارتے رہیں گے۔ یہ قابض فوج تو نہیں ہے' نیشنل آرمی ہے۔ کتنوں کو مارے گی اور

کیوں مارے گی؟ میں نے ان کا ٹیلی ویژن انٹرویو دیکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میری کرسی بہت مضبوط ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ کرسی تو بڑی کمزور ثابت ہوئی۔ کرسی تو فوج کے بل بوتے پر مضبوط تھی۔ جب فوج نے جواب دے دیا تو کرسی کہاں مضبوط رہی!

سیرتِ طیبہ کے مختلف مراحل میں حکمتِ ترتیب

منہج انقلابِ نبویؐ کے ضمن میں پہلے objectively سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ کی سیرت کے کیا مراحل تھے اور ان میں حکمتِ ترتیب کیا تھی۔ پہلے تیرہ برس تک یعنی پوری مکی زندگی میں یہ حکم تھا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں، تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ لیکن ہجرت کے بعد حکم آ گیا کہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۹۰) ''اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اور ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹) ''اور ان (کافروں) سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے''۔ ان دو طرح کے احکام میں بظاہر زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک پراسیس کے دو مختلف مراحل ہیں۔ اسی طرح ایک وقت میں آنحضور ﷺ دب کر صلح کر رہے ہیں۔ صلح حدیبیہ کی شرائط یقیناً بڑی غیر مساوی (unequal) تھیں اور یہ معاہدہ ہونے کے بعد مسلمان بہت رنجیدہ و دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں وہیں قربانی کے جانور ذبح کر کے احرام کھولنے کا حکم دیا تو ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں اٹھا۔ مسلمانوں کے دل اس درجے زخمی تھے کہ ہم کیوں دب کر صلح کر رہے ہیں —— لیکن ایک سال کے بعد قریش کا سردار ابوسفیان چل کر مدینہ منورہ آتا ہے اور وہ خوشامدیں کر رہا ہے، سفارشیں کروا رہا ہے کہ خدا کے لئے صلح کی تجدید کر لیجئے، لیکن حضور ﷺ نہیں کر رہے، کیوں؟ اس لئے کہ اب محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد دعوت کے مرحلے سے نکل کر جہاد و قتال کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے —— اسی کے بارے میں تو ٹائن بی نے کہا تھا :

"Muhammad failed as a prophet but succeeded as a statesman."

اس لئے کہ اس کی آنکھیں صرف ظاہر کو دیکھ رہی تھیں' آنحضور ﷺ کے منہج انقلاب کی حکمتِ ترتیب سے واقف نہیں تھیں' لہٰذا اسے حضور ﷺ کی زندگی میں تضاد نظر آیا اور اس نے اسے واضح کیا۔ ان مستشرقین کو مکہ والے محمد ﷺ تو نبی نظر آتے ہیں' جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ انہیں نظر آتا ہے کہ مکے والا محمدؐ یقیناً یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰؑ کی طرح دعوت دے رہا ہے' تبلیغ کر رہا ہے' ماریں کھا رہا ہے' گالیاں سن رہا ہے' لیکن وہی محمد رسول اللہ ﷺ مدینے میں آ کر ایک مدبر ہے' حکمران ہے' جنگجو ہے' سپہ سالار ہے۔ اور ڈاکٹر منٹگمری واٹ نے اسی فلسفے کے زیر اثر آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ''تضاد'' کو ظاہر کرنے کے لئے Mohammad at Mecca اور Mohammad at Medina دو کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ ان کی نظر میں مکے والا محمدؐ تو بالکل ہی کچھ اور تھا اور مدینے والا محمدؐ بالکل کچھ اور نظر آتا ہے۔ معاذ اللہ — وہ شخصیت ایک ہی ہے' ان کا انقلاب کا پراسیس ایک ہی ہے' لیکن اس پراسیس کے مختلف مراحل ہیں۔ اس انقلاب کا پہلا مرحلہ مکی دور پر مشتمل ہے' جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ع

با نشہ درویشی در ساز دما دم زن!

اور دوسرا مرحلہ اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں یوں بیان کر دیا ع

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!!

ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی انقلاب آ ہی نہیں سکتا۔

یہ ہے اصل میں اسلامی انقلاب کا پراسیس جو اس آیت میں بڑے واشگاف الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرما دیا۔ رسولوں کے ساتھ بیّنات' کتاب اور میزان اتارے جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ ''اور ہم نے لوہا بھی اتارا''۔ پنجابی میں کہا جاتا ہے ''چار کتاباں عرشوں آئیاں' پنجواں آیا ڈنڈا''۔ اس ڈنڈے کی اپنی اہمیت و ضرورت ہے۔ کیا قرآن حکیم صرف اس لئے نازل ہوا ہے کہ

اس کی تلاوت کرتے رہئے' تراویح میں پڑھتے رہئے اور ثواب لیتے رہئے؟ جبکہ قرآن خود یہ کہتا ہے کہ

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (المائدة:٦٨)

''اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو (تمہاری کوئی حیثیت ہماری نگاہ میں نہیں ہے) جب تک کہ تم تورات اور انجیل اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے' اس کو قائم نہیں کرتے۔''

قرآن پڑھتے رہو' قرآن سنتے رہو' قرآن یاد کرتے رہو' حسنِ قراءت کے مقابلے منعقد کرو' جشن نزولِ قرآن مناتے رہو ـــــ لیکن اگر تم قرآن کو قائم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر گویا قرآن تم سے بایں الفاظ مخاطب ہے: يٰٓاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ ''اے قرآن والو! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک تم قرآن کو قائم نہیں کرتے''۔ قرآن قائم کرو' یہ میزانِ عدل ہے' اسے نصب کرو۔ اس نے جو نظام دیا' وہ عدل وقسط پر مبنی ہے۔ جس کا جو حق ہے وہ اس کو دو اور جس کی جو ذمہ داری ہے اس کے اوپر عائد کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے تو پھر صرف اس کی تلاوت کا جو ثواب لے رہے ہو' اس سے کہیں بڑھ کر اس کوتاہی کا گناہ ہو سکتا ہے جو تم اس کی طرف سے برت رہے ہو۔

''بِالْغَيْبِ'' کا مفہوم

﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ ''اور تا کہ اللہ یہ ظاہر کر دے کہ کون غیب کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے''۔ ''بِالْغَيْبِ'' کے بارے میں مجھے مولانا اصلاحی صاحب کی یہ بات پسند ہے کہ یہاں ''بِ'' ظرفیہ ہے۔ اصل میں یہ بڑی پیاری اور فلسفیانہ بات ہے کہ اللہ غیب میں نہیں ہے' غیب میں ہم ہیں۔ عربی کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

اَغِيْبُ وَذُو اللَّطَائِفِ لَا يَغِيْبُ
وَاَرْجُوْهُ رَجَاءً لَا يَخِيْبُ

''میں غائب ہو جاتا ہوں' وہ اللہ جو ذواللطائف ہے وہ تو غائب نہیں ہوتا (وہ تو ہر آن ہر جگہ موجود ہے) اور میں اس سے ایسی امید کا طلب گار ہوں جو ناامیدی میں نہیں بدلتی''۔

چنانچہ یہ تو ہماری آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم غیب میں ہیں' وہ غائب میں نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟
کہ او پیداست تو زیر نقابی!

''تم کس کو تلاش کر رہے ہو؟ کس لئے پیچ و تاب کھا رہے ہو؟ وہ تو سامنے بالکل ظاہر ہے' ہاں تم خود محجوب ہو' پردے کی اوٹ میں ہو''۔

غیب کا پردہ تو تم پر پڑا ہوا ہے۔ تو بالغیب کا مفہوم ہوگا ''غیب میں ہوتے ہوئے''۔ ہم اللہ کو دیکھ نہیں رہے' پھر بھی جو شخص اللہ کے لئے تن من دھن وقف کر دے اس کے لئے اللہ کی طرف سے بڑی شاباش ہے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے مباہات کے انداز میں اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتا ہے کہ میرے یہ بندے مجھ سے جنت مانگ رہے ہیں' حالانکہ انہوں نے جنت کو دیکھا نہیں ہے' اور یہ دوزخ سے پناہ مانگ رہے ہیں حالانکہ انہوں نے دوزخ دیکھی نہیں ہے۔ تو جو شخص غیب میں ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کے لئے تیار ہے اس نے جو دیکھا ہے دل کی آنکھ سے دیکھا ہے' عقل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ظاہر کی آنکھ سے کچھ نہ دیکھنے کے باوجود وہ پکار اٹھتا ہے:

﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

غیب کے ضمن میں کسی کا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ رسول تو غیب میں نہیں تھے یا صحابہ کرام ؓ تو رسول اللہ ﷺ سے غیب میں نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ بھی غیب میں تھے' اس لئے کہ اُن کے سامنے جو موجود تھے وہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تھے' رسول اللہ ﷺ کی رسالت تو غیب ہی کا معاملہ ہے۔ کیا کسی نے اپنی آنکھوں سے جبرائیلؑ کو

آتے ہوئے دیکھا تھا؟ جبرائیلؑ اگر کبھی انسانی شکل میں آئے بھی تھے تو وہ تو گویا ایک انسان تھا جو آیا اور مل کر چلا گیا۔ درحقیقت رسول کی رسالت بھی غیب کی بات ہی تھی اور اُس سے اس وقت وہ لوگ بھی غیب میں تھے جو سامنے نظر آتے تھے۔ اسی لئے تو ان کے درمیان منافقین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم ان کی ہر بات کیوں مانیں؟ ان کے بھی دو ہاتھ ہیں' دو پاؤں ہیں' البتہ جو قرآن یہ کہتے ہیں کہ ان پر نازل ہوا' اس کو ہم مان لیں گے۔ ہمارے ہاں بھی ''حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ'' کے قائلین ''اہل قرآن'' کا جو فتنہ ہے' درحقیقت اس کی جڑیں انہی منافقوں کے ساتھ ملتی ہیں۔

تو یہ جان لیجئے کہ اصل میں جو اللہ کی مدد کر رہا ہے وہ اللہ کے رسولؐ کی مدد کر رہا ہے۔ وہ مدد درحقیقت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب کی نہیں کر رہا' محمد رسول اللہ ﷺ کی کر رہا ہے' اور ظاہر بات ہے ان کی رسالت کا معاملہ غیب کا ہے۔ ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''تا کہ اللہ دیکھے (یا اللہ ظاہر کر دے) کون ہیں (اس کے وفادار اور صادق الایمان بندے) جو غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں''۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر تلوار کی طاقت ہاتھ میں لے کر باطل نظام کا قلع قمع کرنے کے لئے میدان میں آتے ہیں' یا اگر تلوار ہاتھ میں نہیں بھی لیتے تو یک طرفہ جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس دور میں ''مسلح تصادم'' کے متبادل کے لئے اجتہاد کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ ایک تو ہمارے حکمران جیسے بھی ہیں' بہرحال مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اب حکومتوں کے پاس بہت بڑے پیمانے پر مسلح افواج (Armed Forces) ہیں جن کا مقابلہ ممکن نہیں۔ عرب کا حال یہ تھا کہ وہاں کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں تھی اور کوئی سٹینڈنگ آرمیز بھی نہیں' لہٰذا تعداد اور اسلحہ کے اعتبار سے اتنا بڑا فرق نہیں تھا۔ بدر میں تین سو تیرہ مسلمانوں کے مقابلے میں ایک ہزار کفار آئے تھے۔ اس طرح ان میں ایک اور تین کی نسبت ہوئی۔ ہتھیاروں کا فرق لگا لیجئے تو ایک اور دس کی یا ایک اور بیس کی نسبت ہو سکتی ہے۔ چلئے ایک اور سو کی نسبت ہو گی' اس سے تو زیادہ

نسبت نہیں تھی۔ لیکن یہاں جاگیرداری' سرمایہ داری اور ملوکیت کا جو نظام ہے اس کی طاقت کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ فہد کی حکومت کو تحفظ دینے والے ان کی فوج بھی ہے' پولیس بھی ہے' ایئر فورس بھی ہے۔ مصر میں الاخوان کا مضبوط گڑھ ایئر فورس کے ہاتھوں تہس نہس کرا دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہاں اجتہاد کی ضرورت ہے۔ بہرحال جو بھی جس کا حق ہے وہ ادا کیا جانا چاہئے۔ میرے نزدیک اس دَور میں ایرانیوں نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے کہ دو طرفہ جنگ کے بجائے یک طرفہ جنگ کا انداز اپنایا اور گولیاں کھانے کے لئے اپنے سینے کھول دیئے۔ اس ضمن میں ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات ہوئے ہیں کہ ایک جلوس صرف خواتین کا نکلا تھا جو بچوں کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ ان پر فائرنگ ہوئی تو یہ گولیاں کھا کر شیر خوار بچوں سمیت سڑک پر گر پڑیں۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تب شاہ کو وہاں سے تخت و تاج چھوڑ کر اس طرح بھاگنا پڑا کہ ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!

کیونکہ اب اسے اندیشہ تھا کہ کہیں فوج اچانک مجھ پر الٹ نہ پڑے۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی جان سلامت لے کر بھاگ کھڑا ہو۔ تو یہ ہے اصل میں موجودہ حالات کے اعتبار سے اجتہاد کا معاملہ' جسے میں تفصیل سے اپنی کتاب میں درج کر چکا ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیزٌ

آیت کے مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیزٌ ۝﴾ ''یقیناً اللہ بڑی قوت والا' زبردست ہے''۔ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم سے مدد مانگ رہا ہے تو اللہ کمزور ہے اور اس کو تمہاری مدد کی حاجت ہے۔ وہ تو القوی ہے' بڑی قوت والا ہے۔ العزیز ہے' زبردست ہے۔ اس کا ایک حرفِ کن آنِ واحد میں یہ سارا نظام تلپٹ کر سکتا ہے' لیکن اصل میں پیش نظر تمہارا امتحان ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲)

''اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون

بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس امتحان میں پورے اترے ہو۔

اس ضمن میں آیت ۱۰ اس کے ساتھ جوڑ لیجئے:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ﴾

"تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد انفاق اور قتال کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا۔ ان کا درجہ بعد میں انفاق اور قتال کرنے والوں سے بہت بڑھ کر ہے"۔

کسی انقلاب کے جو ابتدائی مراحل ہوتے ہیں ان میں جنہوں نے اپنی جانیں کھپائیں' اپنے مال کھپائے' اپنی صلاحیتیں لگائیں' اپنا وقت لگایا' اپنی زندگی لگائی' ان کا جو رتبہ ہے وہ بعد والوں کو کبھی نہیں مل سکتا۔ ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا! بعد میں جب حالات بدل جائیں تو ان قربانیوں کی وہ قدر و قیمت نہیں رہے گی۔ نیک کام جب بھی کیا جائے گا بہر حال نیک ہے' اس کا ثواب ملے گا' لیکن قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ سب کچھ اس لئے کرنا ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے غیب کے باوجود ـــــ جبکہ اللہ خود بڑی طاقت والا' زبردست ہے۔ وہ جب چاہے آنِ واحد میں اپنا نظام برپا کر سکتا ہے۔ لیکن تمہاری اطلاع و آزمائش کے لئے وہ تمہیں یہ موقع دے رہا ہے۔ آخر میں یہ شعر پھر آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں۔

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

(باقی صفحہ 30 پر)

سلسلۂ نباتات قرآن (قسط3)

اَثْل (جھاؤ)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

عربی : اثل۔طرافا اردو،ہندی : جھاؤ۔تمرس

انگریزی، جرمن، فرانسیسی: Tamarisk نباتاتی نام : Tamarix aphylla

اثل یا جھاؤ ایک خودرَو پودے کا نام ہے جو صحرائی زمین میں، عام طور پر دو یا کے کنارے کنارے اُگتا ہے۔ یہ کڑوا ہوتا ہے اور کھانے کے کام نہیں آتا۔ قرآن مجید میں صرف ایک مقام یعنی سورۂ سبا کی آیات ۱۵ اور ۱۶ میں اِس کا ذکر آیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۭ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝﴾

''قوم سبا کے لئے ان کی اپنی بستیوں میں ایک نشانی موجود تھی۔ ان کے دائیں بائیں دو باغ تھے۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر بجالاؤ۔ ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ لیکن انہوں نے روگردانی کی تو ہم نے اُن پر بند توڑ کر سیلاب بھیج دیا اور ان کے ہرے بھرے باغوں کے بدلے انہیں دو ایسے باغ دیئے جو بدمزا میووں والے اور بکثرت جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں والے تھے۔''

تاریخ کی رو سے ''سبا'' جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم کا نام تھا جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ اس کا وطن عرب کا جنوبی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے

زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمانؑ (965-926ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اس کی غالب اکثریت مسلمان ہوگئی تھی۔ 300ء تک اس قوم نے عروج کا زمانہ دیکھا۔

300ء کے بعد سبا کا زوال شروع ہوا۔ دورِ زوال میں اُن کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑا اور آخر کار اُن کی آزادی تک ختم ہوگئی۔ پہلے حمیریوں اور ہمدانیوں کے باہمی تنازعات سے فائدہ اٹھا کر 340ء سے 378ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہوگئی، مگر مآرب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہوئے، یہاں تک کہ آخر کار 450ء کے لگ بھگ بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر ان آیاتِ قرآنی میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمت ہوتی رہی، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی، وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آبپاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔ 523ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم وستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں "اصحابُ الاُخدود" کے نام سے کیا گیا ہے۔ اُس کے نتیجے میں حبش (ایتھوپیا) کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو حبشی عیسائی سلطنت کے اثر واقتدار میں لانے کے لئے 570ء یا 571ء میں رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے چند روز قبل ہاتھیوں کی مدد سے مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں ''اصحاب الفیل'' کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار 575ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب 628ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج زیادہ تر زراعت کی وجہ سے تھا۔ انہوں نے زراعت کو آبپاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے سے ترقی دی تھی، جس کے مثل کوئی دوسرا نظامِ آبپاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لئے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس

طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق جدھر دیکھو دائیں اور بائیں باغ ہی باغ، سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ اس نظامِ آبپاشی کا سب سے بڑا ذخیرۂ آب (بند یا ڈیم) وہ تالاب تھا جو شہر مآرب کے قریب کوہِ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا، مگر جب قوم سبا کے کرتوتوں کے باعث اللہ کی نظرِ عنایت اُن سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں (بعض مؤرخین کے نزدیک 542ء میں) یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آبپاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔

نظامِ آبپاشی تباہ ہونے کے بعد وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا، اس کی صورت یہ بن گئی: ''سرسبز و شاداب اور پھل دار باغوں کو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں صرف قدرتی جھاڑ جھنکار ہوتے ہیں''۔ جن میں اوّل تو کوئی پھل لگتا ہی نہیں، اور کسی میں لگتا بھی ہے تو سخت کڑوا، کسیلا اور بدمزا، جنہیں کوئی کھا ہی نہیں سکتا۔

قرآن مجید میں اس موقع پر تین نباتات کا نام آیا ہے خمط، اثل اور سدر۔ خمط اور سدر کا ذکر تو ان کے مقام پر (حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق) آئے گا۔ یہاں ''اثل'' کا ذکر مقصود ہے۔ اسے ہمارے ہاں جھاؤ کہتے ہیں۔ یہ قدرتی اور خودرَو ہوتا ہے۔ چھوٹے قد کا ہو تو پودا کہلاتا ہے اور بڑے قد کا ہو تو درخت کہلاتا ہے۔ دنیا بھر میں اُن سرزمینوں میں دریا کے کنارے کنارے پایا جاتا ہے، جو آبپاشی اور کاشت کے قابل نہیں ہیں، بنجر ہیں۔ جھاؤ سخت کڑوا ہوتا ہے اور کھانے کے لائق نہیں ہوتا۔ اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال یہ ہے کہ اس کی ٹہنیوں سے ٹوکریاں اور چند گھریلو اشیاء مثلاً چنگیریاں وغیرہ بنالی جاتی ہیں۔

بقیہ: سورۃ الحدید

''تم بادشاہ پر یہ احسان مت دھرو کہ تم اس کی خدمت میں مصروف ہو۔ بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع دیا ہے''۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم ٥٥

فضیلت کے تین کام

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:
((اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَعُوْدُوا الْمَرِیْضَ وَفُکُّوا الْعَانِیَ)) (رواہ البخاری)

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''بھوکوں کو کھانا کھلاؤ' بیماروں کی عیادت کرو اور جو لوگ ناحق قید کر دیئے گئے ہوں ان کی رہائی کی کوشش کرو''۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تین کاموں کا حکم دیا ہے۔ اوّل بھوکوں کو کھانا کھلانا' دوم بیماروں کی عیادت کرنا' سوم قیدیوں کو رہائی دلانا۔ یہ تینوں کام اونچے درجے کے اخلاق کے مظہر ہیں۔ ان پر عمل کرنے والا دنیا میں عزت واحترام حاصل کرتا ہے اور آخرت میں اجرِ عظیم سے نوازا جائے گا۔

ان کاموں میں پہلا کام بھوکوں کو کھانا کھلانا ہے۔ بنی نوعِ انسان اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز ہیں۔ جہاں ان پر حقوق اللہ کی ادائیگی لازم ہے وہاں حقوق العباد پورے کرنا بھی ان پر فرض ہے۔ یوں معاشرے میں محروم طبقات کی ضروریات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ انسان تو شرفِ انسانیت سے عاری ہے جسے صرف اپنے لئے ہر طرح کی سہولیات اور آسائشیں اکٹھی کرنے کی دھن لگی ہوئی ہو اور وہ معاشرے میں موجود فقراء' مساکین اور مفلس لوگوں کی تکالیف اور مشکلات سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو۔ ایسا بے حس انسان نہ صرف انسانیت کے نام پر داغ ہے بلکہ اس کا مقام حیوانات سے بھی بدتر ہے' کیونکہ ہمدردی' خیر خواہی اور دردِ دل کے جذبات ہی انسانیت کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

سورۃ المدثر میں ذکر ہے کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو جنتی دوزخیوں سے پوچھیں گے ''تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی؟'' اس پر وہ جواب دیں گے ''ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور فقیروں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے''۔ یہاں خود دوزخی لوگ جن کاموں کو دوزخ میں پہنچانے کا سبب بتاتے ہیں ان میں پہلی بات نماز کا نہ پڑھنا ہے۔ یہ اللہ کے حق کو ضائع کرنا ہے۔ اور دوسری بات بھوکوں کو کھانا نہ کھلانا ہے اور یہ حقوق العباد کی تلفی ہے۔ پھر فضول قسم کے بحث مباحثے میں الجھنا اور آخرت کی باز پرس سے بے نیاز ہو کر منکرات پر دلیر ہونا یہ ساری باتیں دوزخ میں لے جانے والی ہیں۔ جب آدمی بھوک سے بیتاب ہو تو اُس پر کیا گزرتی ہے؟ کیا کوئی ایمان والا بھوکے آدمی کی بھوک کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مولانا مودودی مرحوم تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت کے باوجود اُس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے''۔ یہ اس لئے کہ روزی کی فراوانی اور تنگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مفلس اور نادار لوگوں کی روزی دنیا میں مالداروں کے رزق میں شامل کر دی گئی ہے اور انہیں تلقین کی گئی ہے کہ یہ حق حق داروں کو پہنچائیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۞﴾ (الذّٰریٰت:۱۹) ''اور ان کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والے مفلسوں کا حصہ ہے''۔

پس لازم ہوا کہ خوشحال اور مالدار لوگ معاشرے کے پسے ہوئے اور دبے ہوئے لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ دیکھئے سورۃ الماعون میں ایک برے کردار کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے: ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۞﴾ ''اور وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا''۔ تو بھوکے کو کھانا نہ کھلانا اخلاقی اعتبار سے بھی انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔ یہاں طعام المسکین کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ اس کا معنی ہے مسکین کا کھانا، یعنی صاحب ثروت اور دولت مند لوگوں کے مال میں مسکین کا کھانا شامل کر دیا گیا ہے۔ صاحب مال کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف خود بھوکوں کو اس کا کھانا دے بلکہ دوسروں کو بھی اس اہم کام کی ترغیب دے۔ اسی بات کو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۶ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ .....﴾

''اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو اُن کا حق دو۔''

یعنی محروم لوگوں کی خبر گیری کرنا مالداروں پر فرض ہے اور فرض کا ادا نہ کرنا نافرمانی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بھوکے کو کھانا کھلانے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے پھل اور میوے کھلائے گا اور جس مسلمان نے پیاس کی حالت میں دوسرے مسلمان کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی سربمہر شراب طہور پلائے گا''۔ (سنن ابی داؤد' جامع الترمذی)

دوسری بات جس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے وہ ہے مریض کی عیادت کرنا۔ یہ آسان سا کام ہے مگر اجر وثواب کے اعتبار سے اس کی بڑی عظمت بیان کی گئی ہے۔ دنیا میں دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کبھی انسان تندرست ہوتا ہے تو کبھی بیمار۔ بیماری کی حالت میں انسان کو ہمدردی کے کلمات اور حوصلہ افزا الفاظ چین اور اطمینان فراہم کرتے ہیں' جبکہ عیادت کرنے والے کے لئے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود بیمار کی بیمار پرسی کے لئے جاتے' اس کے پاس تھوڑی دیر ٹھہرتے اور حوصلہ افزا کلمات کہہ کر اسے تسلی دیتے۔ آپ نہ صرف مسلمانوں کی عیادت کے لئے جاتے بلکہ غیر مسلموں کی بیمار پرسی کے لئے بھی چلے جاتے تھے۔ آپؐ کے اخلاق کی یہ بلندی بعض لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا باعث بھی بن گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بھی مریض کی عیادت کی تلقین کی ہے اور اس کے علاوہ کئی دوسرے موقعوں پر اس کام کی فضیلت بتائی ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ مؤمن جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ واپس آنے تک گویا جنت کے باغ میں ہوتا ہے''۔ (صحیح مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو اُس کی عمر کے بارے میں اس کا دل خوش کرو (یعنی اس کے ساتھ حوصلہ افزا باتیں کرو)۔ اس طرح کی باتیں کسی ہونے والی چیز کو روک تو نہ سکیں گی لیکن اس سے اس کا دل خوش ہوگا''۔ (جامع الترمذی' سنن ابن ماجہ)

دوسروں کا دل خوش کرنا خود بڑے اجر وثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ

عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس بندے نے کسی مریض کی عیادت کی تو اللہ کا منادی آسمان سے پکارتا ہے کہ تو مبارک' اور عیادت کے لئے تیرا چلنا مبارک' اور تو نے یہ عمل کر کے جنت میں اپنا گھر بنالیا''۔ (سنن ابن ماجہ)

تیسری بات جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا ہے وہ ہے قیدیوں کو رہائی دلانا۔ بعض اوقات کسی شخص کو ناحق قید میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسا شخص اس بات کا حق دار ہے کہ اس کی رہائی کے لئے جدوجہد کی جائے اور اس کام کے لئے وقت اور پیسہ خرچ کر کے اسے ناحق سزا سے چھڑا کر آزاد کرایا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۞ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۞﴾ ''گردنوں کا چھڑانا' یا بھوک کے دن کھانا کھلانا''۔ یعنی یہ کام بہت بڑے اجر کے ہیں۔ قیدیوں میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کسی حادثے کے سبب یا ناموافق حالات کے باعث زیر بار ہو گئے ہوں اور اُن کے وسائل اس قابل نہ ہوں کہ وہ اس افتاد سے آزاد ہو سکیں۔ غلام یا باندی کا آزاد کرانا' قرض دار کا قرض اتارنا' تاوان کی زد میں آئے ہوئے کی مدد کرنا سب فک العانی کا مدعا پورا کرتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن پر کسی کی ضمانت دینے کی وجہ سے مالی بوجھ پڑ گیا ہو اور اُن میں اس کی ادائیگی کی سکت نہ ہو۔ پس یہاں بھی مساکین اور فقراء کی مالی مدد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ وہ زندگی کی پریشانیوں اور مشکلات سے نکل سکیں۔ پھر اس کام میں مال خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ ایسے انفاق سے مال میں کمی نہیں آتی' بلکہ اجر وثواب کے علاوہ مال میں بھی برکت ہوتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ سخی ہمیشہ سخی رہتا ہے' مال خرچ کرنے کے باوجود اُس کا مال کم نہیں ہوتا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی (بلکہ اضافہ ہوتا ہے)''۔ (صحیح مسلم)

بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دس سال پرانی تجویز نئے کتابچے کی صورت میں

پاک بھارت مفاہمت اور مسئلہ کشمیر کا حل

(قیمت: 20 روپے)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

اخلاقِ نبوّت سے اکتسابِ فیض کی

شرط اور علامت

تحریر : پروفیسر حافظ احمد یارؒ

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ (الاعراف:۱۹۹)

سیرت نگارانِ رسول ﷺ میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لئے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟ مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب 'ثورۃ **الاسلام وبطل الانبیاء**'' کا آغاز ہی اسی طرح کیا ہے:

''دنیا کی تاریخ' انسانی تمدن کی داستان اور قدیم وجدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی قابل تو جیہہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں جنہیں پڑھ کر یا سن کر آدمی محوِ حیرت رہ جاتا ہے ـــــ اور اسی قسم کے ناقابلِ فہم معموں میں سے یہ چیستاں بھی ہے کہ آخر اللہ نے انوارِ نبوت و رسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لئے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا؟''۔(۱)

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال دہرایا ہے:

''آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا سرچشمہ اور اس کا مرکز ومنبع بنانے کے لئے چن لیا؟''(۲)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں ''عربوں کی خصوصیات

---

(۱) ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاء : لطفی' ص ۷

(۲) ثورۃ الاسلام وبطل الانبیاء : لطفی' ص ۳۸

اور خیر الامم بننے کی صلاحیت'' کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب سے بحث کی ہے۔ اس موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ''نبی رحمت'' میں کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ''محمد رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟''۔

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لئے اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب یا نکات گنوائے ہیں مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے' جس نے ان لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

☆ یہ سوال کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی تمام مہذب اور متمدن قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گمنام نشینوں کو اس منصب عظیم کے لئے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبی ہندوؤں' بدھوں' یہودیوں یا چینیوں' ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک قوم میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعے سے ہوا؟

☆ جو وقت کی ''بڑی طاقتیں'' (Super Powers) تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی ''بہترین'' امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟

بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں' اس لئے کہ مصالح کلیہ الٰہیہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی لئے خود قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام:۱۲۴)

''اور اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا یہ پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے۔''

تاہم اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آ سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبی ﷺ سے انتساب اور اسلام کے نعرہ ہائے بے حد و حساب اور ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ کیا ہم کہیں عہدِ جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط قرار دیا جا سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کایا پلٹ دی وہ عجائباتِ تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلب ماہیت اور تاریخ عالم کے اس

سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت نگار ظہورِ اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب کی خصوصاً دینی' معاشی' سماجی اور اخلاقی حالت بلکہ ان سب حالتوں کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے۔

عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم وبیش سیرت یا تاریخ کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے' لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ کا تجزیہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دَور کے رسم ورواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معناً یہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے' بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی صحیح تشخیص نظر آتی ہے۔ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہبِ عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کا موقع ملا جن کا شاہ صاحبؒ کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرتِ انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی اس ساری تحلیل وتفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعیش پسندی' تن آسانی اور دنیوی لذائذ ومفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتسابِ فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں' خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الامم بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ہرگز ممکن نہیں ہوتا ـــــ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیتِ الٰہی نے ان اقوام کو اس منصبِ عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل وفضائل پر ایک نظر ڈالیں' جو فیضانِ نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے' تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی ہی' ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر اسے ''شب ظلمت''، ''عرب کا تاریک دَور'' اور ''فسادِ بر و بحر'' وغیرہ عنوانات

کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام' سنگدلی و سفاکی' چوری اور رہزنی' قتل و غارت' بے حیائی و بدتمیزی' زنا و فواحش' نسبی تعصب و غرور' قمار بازی' شراب نوشی اور دختر کشی و سود خوری میں قریب قریب ضرب المثل تھے۔ اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معریٰ نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظام اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقِ حسنہ کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی' فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصبیت دراصل قومی حمیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت' پابندیٔ عہد' شجاعت' فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی)' امانت' راست گوئی اور پاکدامنی کو کرم الخلق اور خصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے توقیر و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقِ حسنہ کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی' حب جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا—— مشہور حدیث ((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا)) میں اس ''تحویل قبلہ اخلاق'' کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خِيَارُكُمْ کی تفسیر ((خِيَارُكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا)) سے کی گئی ہے۔

دورِ جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے' اس کی ایک مثال تاریخ نے ''حلف الفضول'' کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اسی حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم و بے انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے' ایک مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔

یہ حلف جسے سیرت نگار ''اکرم حلف واشرفہ سمع بہ فی العرب'' (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں' ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض ومقاصد یوں تھے:

''انہوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کیے گئے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔''(۱)

کہا جا سکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرۂ نفاذ بہت محدود تھا' اس کا مقصد صرف حرم مکہ میں مظالم کی روک تھام تھا' اور اس کا فائدہ بھی بالآخر اہل مکہ ہی کو تھا تاکہ حرم کی عزت وحرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے' لیکن کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟ چلئے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی ـــــ حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدہ کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ منصفانہ قوت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا۔(۲)

آج یو این او اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں' اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت' ان کی فطرتِ سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الامم کے ہراول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاں ﷺ خود بھی (بعمر بیس سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدہ میں شامل ہوئے تھے۔ آپؐ اس معاہدہ سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف وتحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس وخاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں' تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظت حق اور اعانت مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے کچھ نیچے ہی کے درجے پر ہیں۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن کثیر' جلد اول' ص ۲۵۹۔۶۲۱۔

اہل عرب کی مثال ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت ونگہداشت کے نہ ہونے کے باعث خودرو خاردار جھاڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوت نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادیٔ برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو ترتیب دے کر مکارم اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حق دار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ﴿وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا﴾ (الفتح:۲۶)

ہمارے اس موقف کہ نبوت سے اکتساب فیض کے لئے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں' کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متصف بھی۔

سب سے پہلے اُمّ المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکبازی کے باعث ''طاہرہ'' کے لقب سے مشہور تھیں۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں:

''وہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاکدامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں''۔

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپؐ کو گھر میں بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا:

''اے میرے چچازاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ آپ سے میری (برادری کی) رشتہ داری بھی ہے' آپ اپنی قوم میں صاحب عزت بھی ہیں' ان سب پر مستزاد آپ کی امانت' اخلاص اور راست گفتاری ہے''۔

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات وحالات پیش آئے تھے ان کی بناء پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

''ہرگز نہیں' بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا' آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں' دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں' محتاجوں کے کام آتے ہیں' مہمان نواز ہیں اور راہ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں''۔

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپؓ ایک با اخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔ حضرت ابوبکر

صدیق ؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنہ کے بیان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابوبکر الصدیق ؓ بھی آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انہیں ابن الدغنہ ملا۔ (اصل نام سعیہ بن رفیع تھا اور وہ اس وقت امابیش کا سردار تھا جو ایک مجموعہ قبائل تھا) اس نے پوچھا تم کہاں چلے؟ جب انہوں نے بتایا کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی ہے اور سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے' تو ابن الدغنہ نے کہا:

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں' آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں' نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلئے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔''

ہم ان مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں' ورنہ تمام ''سابقین اولین'' صحابہؓ میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خالص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ؐ کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپ ؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپ ؐ کے ''خلق عظیم'' ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے صاحب خلق عظیم ہونے کا تعلق آپ ﷺ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیاتِ نبوی ؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ (کہ آپ ؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلمہ امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مشہور حدیث ''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ'' (کہ آپ ؐ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ سورۃ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے

کہ سورۃ القلم بلحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دَور کی مکی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞﴾ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن پاک نے پیش کی۔ (اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۂ یونس اور سورۃ العنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی مکی دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)۔

قرآن حکیم کا آپ ﷺ کے خلق عظیم کو بطور دلیل پیش کرنے سے مدحیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں' ازاں جملہ:

اوّلاً یہ کہ ـــــ اہل مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل وفضائل کے نمائندہ قرار دیئے جا سکتے ہیں) میں اتنی عموماً اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کئے جا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی سورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۴) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہ رذائل ہو' چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو' اسے ہیچ سمجھو۔ فرمایا:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۞ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۞ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۞ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۞ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۞﴾ (القلم: ۱۰۔۱۴)

''ہرگز نہ دبو اُس شخص سے جو قسمیں کھانے والا' پست فطرت' طعنہ جو' چغل خور' مانع خیر' دھاندلی باز' بدعمل' جفا کار اور ساتھ ہی بداصل بھی ہے' محض اس بنا پر (چوہدری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال واولاد رکھتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین ''خلق عظیم'' اور ان آیات میں بیان کردہ ''رذائل تسعہ'' کے تغایر وتباین کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ ـــــ اس آیت ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞﴾ کے مضمون اور اس کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قبل از بعثت ہی صاحب خلق عظیم تھے۔ محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں:

''اور یہ خلق عظیم جس کی بنا پر آنحضور ﷺ اس ثنائے ربانی کے مستحق ٹھہرے' اس سے آپؐ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے' بلکہ اسی چیز نے آپؐ کو اس برگزیدگی اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لئے کون اور کتنا موزوں ہے''۔

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضور ﷺ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے

تدریجاً نمودار کیا ہے۔قرآن وسنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت ﷺ کے خلق عظیم کے خدوخال کی مکمل تصویر کشی ہے۔اوراسی لئے آپ ؐ کی ذات گرامی کو اُمت کے لئے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا۔خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ —— اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوتِ محمدی (علیٰ صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی ونقلی دلائل کی تبلیغ واشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔اس کے لئے عہد رسالت اور قرنِ اوّل کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضور ﷺ کے صرف دو معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ایک قرآن دوسرے اخلاق النبیؐ۔ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا یا نبی کریم ﷺ کا خلق عظیم دیکھ کر۔اہل مکہ خلق محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے —— مابعد النبی ادوار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے کہ ایک طرف اخلاقیاتِ نبویؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسب استطاعت) فرض عین ہے اور دوسری طرف اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

رابعاً یہ کہ —— آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور مؤثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لئے اس کے غلبہ کا دورِ ثانی لانے کے لئے اور فیوض و برکاتِ نبوت کو پھیلانے کے لئے صرف اور صرف گرمئ گفتار، پروپیگنڈا اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے اُمت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی نظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا اور توحید، رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسن اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمان کی ایک لازمی خصوصیت یا بالفاظ دیگر نبوت سے اکتساب فیض کی علامت قرار دیا۔یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام ؓ کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱) حضرت ابوذر غفاری ؓ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں۔انہوں نے

جب آنحضرت ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو دریافت احوال کے لئے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس جا کر آنحضور ﷺ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی:

''وہ بھلائی کا حکم دیتا' برائیوں سے منع کرتا اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے''۔

یہاں اخلاق کے ضمن میں ''تعلیم'' یا ''تلقین'' یا ''تبلیغ'' وغیرہ کی بجائے ''امر'' کا لفظ قابل غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوتِ عمل سے ہے' یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

۲) ہجرتِ حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا' بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے بعد مسلمانوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابل غور ہیں:

> کہا: ''اے بادشاہ! ہم پروردۂ جاہلیت قوم تھے' بتوں کو پوجتے' مردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے۔ رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے' اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کر کھا جاتا۔ پھر اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان' حسب و نسب اور جس کی سچائی' امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے واقف تھے۔ انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے' امانت ادا کرنے' رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے' پڑوسی سے حسن سلوک کرنے' ناجائز اور حرام باتوں اور خونریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں' جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا۔ پس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی' جو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بنایا اس کو حلال تسلیم کیا''۔ (۱)

آنحضور ﷺ نے مکارمِ اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپ زمانۂ جاہلیت کے اصحابِ مکارم و محاسن کی قدردانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام

عبد اللہ بن جدعان (بانی حلف الفضول) کو آپ نے کتنی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا' حالانکہ ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ جس آدمی نے (ایمان لا کر) زندگی میں ایک دفعہ بھی اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟

اس قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے' وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

''حضور! میرا باپ ہلاک ہو گیا اور فدیہ گزار نہ رہا۔ اگر یہ مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں۔ میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں' میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا' وہ نیک شہرت کا مالک تھا' مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں ننگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا' میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہی تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے''۔ پھر حکم دیا: ''اسے رہا کر دیا جائے کیونکہ اس کا باپ مکارم اخلاق کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی مکارم اخلاق کو پسند فرماتا ہے''۔

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہؓ بن نیار کھڑے ہوئے اور سوال کیا: ''یارسول اللہ ﷺ کیا مکارم اخلاق آپؐ کو (اس قدر) پسند ہیں؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حسن عمل کے بغیر نہیں جائے گا''۔

جب بھی ہم مکارم اخلاق اور اخلاقیاتِ نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لئے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب ضروری ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا حقدار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیر اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ''اجتناب کبائر'' اور ''مسابقۃ الی الخیرات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (النساء: ۳۱)

''جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے

رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے قصور محو کر دیں گے اور تم کو مقامِ عزت پر جگہ دیں گے''۔

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک (مقام) کا ایک مرکز توجہ (یا مطمحِ نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ و دو کرو''۔

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لئے اس ترتیب اور تدریج کو ملحوظ رکھا۔ آپؐ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے افراد میں اسلام کی طرف ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے اور ایسے شخص میں نبوت سے اکتسابِ فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبیؐ سے متعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام کو قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں۔ اسلام لانے کے بعد' مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہونا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔

بقول اقبال۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر روزِ تمہیدِ رسالت بے خبر
کارِ او گفتارِ بے کیفِ عمل او نیامِ علم بے سیفِ عمل
لذتِ ایماں فزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل!

''وہ جو کہ صدق و امانت سے بے خبر ہے گویا رسالت کی تمہید سے بے خبر ہے۔ اس کا کام عمل کے بغیر گفتار ہے اور اس کا علم عمل کی تلوار کے بغیر بے نیام ہے۔ ایمان کی لذت عمل میں آگے بڑھنا ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو''

نبوت سے اکتسابِ فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارمِ اخلاق ہیں جنہیں مقصود بعثت نبویؐ کہا گیا ہے۔

((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) مَحَاسِنَ الْاَعْمَالِ))

''میں مکارم اخلاق کو یا محاسن اعمال کو مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔''

مگر مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچ سکنا فیض نبوت سے یکسر محرومی نہ سہی ''کم نصیبی'' کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموز بے خودی میں گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

آنکہ مہتاب از سرانگشتش دونیم
رحمت او عام و اخلاقش عظیم
از بہارش رنگ و بُو باید گرفت
بہرۂ از خُلق او باید گرفت!

''جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔ اس کی رحمت عام ہے اور اس کا اخلاق بہت عظیم (بلند) ہے۔ ان کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہئے' ان کے اخلاق سے حصہ حاصل کرنا چاہئے۔''

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے؟ اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاں ہمارا کیا درجہ ہے؟ (کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو بولہبی ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبویؐ سے کتنا حصہ پایا ہے؟

حافظ صاحب مرحوم کا یہ مضمون گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے سیرت نمبر (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا تھا۔

قارئین توجہ فرمائیں

بعض کرم فرماؤں کو ماہنامہ میثاق' حکمت قرآن اور ہفت روزہ ندائے خلافت کا اجراء یا تجدید بذریعہ VPP کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات ہمارے معزز قارئین خود ہی VPP ارسال کرنے کی فرمائش کرتے اور بعض اوقات ان کے احباب میں سے کسی کی سفارش پر ایسا کیا جاتا ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں کہ جب تک ادارے کو VPP کی رقم موصول نہیں ہو جاتی اس وقت تک پرچے کا باقاعدہ اجراء عمل میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں بعض اوقات 4 سے 6 ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر قارئین کی جانب سے VPP چھڑا لینے کی اطلاع ہمیں موصول ہو جائے تو (رقم موصول ہونے سے پہلے بھی) پرچے کا اجراء عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

امام وکیع بن الجراحؒ

(۱۲۸ھ ـــ ۱۹۶ھ)

عبدالرشید عراقی

دوسری صدی ہجری میں جن ائمہ اسلام نے دین اسلام کی قندیلیں روشن کیں ان میں امام وکیع بن الجراح سرفہرست ہیں۔ ۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جن اساتذہ وشیوخ سے علوم دینیہ کی تحصیل کی اُن کی فہرست حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں درج کی ہے۔ مشہور اساتذہ یہ ہیں: ہشام بن عروہ، ابن جریج، اوزاعی، سفیان ثوری، خالد بن دینار، ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ۔ (۱)

فراغتِ تعلیم کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے فضل وکمال کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ مختلف ممالک کے طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور بے شمار طالبانِ علم نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ مشہور تلامذہ یہ ہیں: یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل، قتیبہ بن سعید۔ (۲)

امام وکیع بن الجراح نے ۳۳ سال کی عمر میں تدریس کا آغاز کیا اور ۳۵ سال تک آپ خدمتِ اسلام میں مصروف رہے۔ علم وفضل کے اعتبار سے امام وکیع بن الجراح بلند مرتبہ ومقام پر فائز تھے۔ علمائے اسلام نے ان کے تبحر علمی اور جامع الکمالات ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ عدالت وثقاہت، حفظ وضبط، امانت ودیانت، تقویٰ وطہارت اور زہد وورع میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ خطیب بغدادی نے امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما رأیت رجلا قط مثل وکیع فی العلم و الحفظ والاسناد والابواب

مع خشوع و ورع (۳)

''میں نے علم' حفظ' اسناد اور ساتھ ہی ساتھ ورع وتقویٰ میں وکیع بن الجراح کا مثل کسی کو نہیں دیکھا''۔

علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں:

ماکان بالکوفة فی زمان وکیع أفقه ولا أعلم بالحدیث 'کان وکیع جهبذاً (۴)

''وکیع کے زمانہ میں کوفہ میں ان سے بڑا فقیہہ اور حدیث کو اُن سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ وکیع عبقریٔ وقت تھے''۔

حافظ ابن جوزی نے ان کے شاگرد امام یحییٰ بن معین کا یہ قول اپنی کتاب ''صفوۃ الصفوۃ'' میں درج کیا ہے:

کان وکیع فی زمانه کالاوزاعی فی زمانه (۵)

''وکیع کی اپنے زمانہ میں وہی حیثیت تھی جو اوزاعی کی اپنے وقت میں تھی''۔

علومِ دینیہ میں ان کے جامع الکمالات ہونے کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی حافظہ کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''میں نے گزشتہ ۱۵ سال کے عرصہ میں سوائے ایک دن کے کبھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ میں بھی بہت سرسری طور سے دیکھا اور کتاب کو پھر اس کی جگہ پر رکھ دیا''۔ (۶)

علمی کمالات کے ساتھ ساتھ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے۔ دُنیوی دولت اور وجاہت کی آپ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کو منصب قضا کی پیشکش کی لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا۔ (۷)

عبادت وریاضت میں بھی بے مثل تھے۔ خشیتِ الٰہی کا ان پر بہت زیادہ غلبہ تھا۔ تلاوتِ قرآن سے بہت زیادہ شغف تھا۔ صوم الدہر تھے۔ ان کے صاحبزادے سفیان بن وکیع بیان کرتے ہیں:

''میرے والد امام وکیع بن الجراح صوم الدہر تھے۔ صبح سویرے بیدار ہو جاتے۔ فجر کی نماز کے بعد مجلس درس شروع ہو جاتی تھی۔ دن نکلنے تک اس میں مشغول رہتے۔ پھر گھر جا کر ظہر کی نماز تک قیلولہ فرماتے۔ اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے۔ پھر عصر تک طلبہ کو قرآن کا درس دیتے۔ پھر مسجد آ کر عصر کی نماز پڑھتے تھے۔ اور اس سے فارغ ہو کر پھر درسِ قرآن شروع ہو جاتا اور شام تک مذاکرہ میں منہمک رہتے۔ پھر مکان پر تشریف لے جاتے۔ افطار فرماتے' اس سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے تھے''۔(۸)

امام وکیع اگرچہ منصب امامت و اجتہاد پر فائز تھے لیکن فتویٰ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دیتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:

کان وکیع یفتی لقول ابی حنیفه (۹)

''امام وکیع امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تھے''۔

تصانیف

علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ امام وکیع صاحبِ تصانیف تھے۔ حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں:

صنّف التصانیف الکثیرة (۱۰) ''انہوں نے بکثرت کتابیں لکھیں''۔

لیکن ان کی تصانیف کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

وفات

۱۹۶ھ میں کوفہ اور مکّہ کے درمیان قید کے مقام پر رحلت فرمائی۔ عمر ۶۸ سال تھی۔(۱۱)

حواشی

۱) تہذیب التہذیب' ج ۱۱' ص ۱۲۲۔۱۲۴
۲) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۶۷
۳) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۷۳
۴) شذرات الذہب' ج ۱' ص ۳۵۰
۵) صفوۃ الصفوۃ' ج ۳' ص ۱۰۲
۶) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۷۵
۷) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۷۵
۸) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۷۱
۹) تاریخ بغداد' ج ۱۳' ص ۴۷۱
۱۰) صفوۃ الصفوۃ' ج ۳' ص ۱۰۲
۱۱) تبع تابعین' ج ۲' ص ۴۴۴

اولاد کے حقوق
اسلام کی نظر میں

تحریر: سید وصی مظہر ندوی

اللہ تعالیٰ نے نکاح کے طریقے کو نہ جنسی لذت اندوزی کے لئے جاری فرمایا ہے اور نہ محض نفس کو آوارگی سے بچانے کی غرض سے' بلکہ اس کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہونہار بچوں کی پیدائش بھی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت ایک خاص مدت تک نوع انسانی کو باقی رکھنا چاہتا ہے' تاکہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو اس کے خلیفہ کی حیثیت سے استعمال کر کے اس عالم کو آباد کرے' اور اس کے حیوانات و نباتات پر' پانی اور ہوا پر' نیز نباتی اور معدنی دولت پر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اقتدار کو استعمال کر کے ان سب کو اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کے کامیاب بنانے میں استعمال کرے۔

اللہ تعالیٰ نے بقائے نوع کے لئے جنسی تقاضے کو ایک وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہے۔ اس غرض کے لئے مرد اور عورت میں وہ تمام اسباب جمع کر دیئے ہیں جو اس جنسی تقاضے کو قوی تر بنانے کے ساتھ ساتھ اس تقاضے کی تکمیل ہی سے آدم علیہ السلام کی ذریت کا تسلسل قائم رکھتے ہیں' تاکہ یہ ذریت اللہ تعالیٰ کی نائب اور خلیفہ بن کر اس دنیا میں اپنے دورِ امتحانی کی تکمیل کرے' جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (البقرۃ: ۳۰)

''بیشک میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔''

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو پورا کرتے ہوئے شادی سے عفت اور لذت کے ساتھ ساتھ اچھی اولاد کی پیدائش کو بھی اپنا مقصود بنائے تاکہ اس کا جنسی عمل موجب اجر و ثواب بھی قرار پائے' کیونکہ ہماری شریعت میں نہ صرف تمام جائز کام بلکہ انسانی خواہشات کے تقاضوں کی تکمیل بھی عبادت بن جاتی ہے' بشرطیکہ ان تمام اعمال میں

نیت ان مقاصد کا حصول ہو جو شریعت میں مطلوب ہیں' جیسا کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیٍٔ مَا نَوٰی)) (متفق علیہ)

''اعمال صرف نیتوں سے ہیں اور ہر آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی ہو۔''

اولاد کی تربیت

زمین اسی وقت اصلاح پذیر ہوتی ہے جب اس کے رکھوالے اس کا اہتمام کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کی اصلاح کی اصل ذمہ داری والدین ہی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ انہی کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی پرورش و پرداخت کریں' ان کی صاف ستھری تربیت کا اہتمام کریں۔ تاکہ وہ بڑے ہو کر عالی حوصلہ اور بلند اخلاق ہوں۔ یہ اسی طرح کی ذمہ داری ہے جیسی ایک مالی کی ذمہ داری ہوتی ہے' جو اپنے باغ کی سیرابی اور شادابی پر پوری توجہ صرف کرتا ہے تاکہ اس کے پودے اچھی طرح نشوونما حاصل کریں اور ان پودوں سے خوبصورت پھول اور لذیذ پھل حاصل ہو سکیں۔

اولاد والدین کے پاس ایک امانت ہے۔ ان کے بارے میں ان سے اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ انہوں نے ان کے معاملات اور ان کی تربیت کے سلسلہ میں کیا کیا۔ والدین پر فرض ہے کہ وہ بچوں کی ایسی تربیت کریں جس سے وہ گناہوں سے اور ان کے نتیجے میں جو اخروی عذاب ہوگا اس سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝﴾ (التحریم:٦)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خاندان کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں' جس پر نہایت سخت اور قوی فرشتے مقرر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے (بلکہ) وہی کچھ کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

اس ذمہ داری کا ذکر کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَاعِیَةٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَّعِیَّتِهَا)) (متفق علیہ)

''مرد اپنے گھر کا نگران ہے اور اپنے زیر تحویل (افراد اور اشیاء) کے بارے میں جواب دہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اور اپنے زیر تحویل (افراد اور اشیاء) کے بارے میں جواب دہ ہے''۔

تربیت کی راہ میں دشواریاں

بچوں کو تربیت دینا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے' لیکن اللہ تعالیٰ اس کام کو صبر' اختیارات کے صحیح استعمال' وسعت نظر اور خوش تدبیری سے آسان کر دیتا ہے۔ لہٰذا بچوں کی حرکتوں سے نہ بیزار ہونا چاہئے اور نہ ان کے ساتھ تشدد اور سنگ دلی کا برتاؤ کرنا چاہئے' کیونکہ بیزاری اور تشدد کا نتیجہ ہمیشہ الٹا نکلتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ بچوں کی شرارتوں اور پیہم متحرک رہنے کی ان کی فطری خواہش کو کسی مفید کام میں لگایا جائے۔ والدین کو اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرنے کا انتہائی خواہش مند اور حریص ہونا چاہئے' تاکہ ان کی اولاد خاندان کی خوش بختی اور مسرت کا سرچشمہ ثابت ہو۔ والدین کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ان کے بچوں کے دل نہایت بیش قیمت شے ہیں' جو ابتداءً ہر نقش سے خالی ہوتے ہیں' البتہ جو اچھی یا بری باتیں وہ سنتے ہیں یا دیکھتے ہیں وہ ان کے قلوب پر نقش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے والدین کو ان کے دلوں میں نیکی اور خیر کی تخم ریزی کرنی چاہئے' خرابیوں اور برائیوں سے ان کو حتی الوسع دور رکھنا چاہئے۔ ان کے لئے ایسا ماحول فراہم کرنا چاہئے جس میں وہ شریفانہ اخلاق اور پاکیزہ تعلیم سیکھ سکیں اور جس ماحول میں وہ اپنے دین اور اپنی سیرت کے تحفظ کا اہتمام کر سکیں۔ والدین پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ان کو بری صحبت سے بچائیں تاکہ وہ ان برے دوستوں کی بدولت کہیں اپنی خاندانی صلاحیت اور درسگاہ کی تعلیم و تربیت سے محروم ہو کر نہ رہ جائیں۔

بچوں کی سلیم فطرت اور ان کی معصومیت پر والدین کے ان اثرات کے بارے میں جو وہ بچوں کو بھلائی کی فطری راہ پر باقی رکھنے میں یا ان کو برائی کی طرف پھیرنے میں صرف کرتے ہیں' حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیه)

''ہر بچہ (صحیح) فطرت پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اس کو یہودی بنا ڈالتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔''

اعلیٰ تربیت کے چند اصول

اعلیٰ تربیت کی اساس نرمی' خوش تدبیری اور بہترین عملی نمونہ پر قائم ہے' لہٰذا درشتی صرف انتہائی ضرورت کی صورت میں اختیار کی جائے اور یہ درشتی بھی ایک حد کے اندر ہو' مسلسل نہ ہو۔ اس میں دشمنی کی بو بھی محسوس نہ ہو' بلکہ بچے میں یہ احساس پیدا ہو کہ اس کے ساتھ جو سختی کی جارہی ہے یا اس کو جو سزا دی جارہی ہے وہ دراصل خود اسی کے مفاد کے پیش نظر ہے۔ اس سے نہ کسی کو دشمنی ہے نہ نفرت۔ اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو بچہ ضد اور ہٹ دھرمی کی راہ اختیار کر کے اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرے گا۔

''ماحول'' تربیت پر بہت اثر انداز ہوتا ہے' لہٰذا بچے کے سرپرستوں کو چاہئے کہ وہ ایسا ماحول فراہم کریں جو زرخیز اور شاداب زمین کی مانند ہو' جس کے اندر بچہ عمدہ اور پسندیدہ اخلاق اور عادات سیکھے' نہ اس کی نگاہ کسی ایسے کام کو دیکھے اور نہ اس کے کان کسی ایسی بات کو سنیں جو دین' اخلاق یا شائستگی کے خلاف ہوں۔

بچوں کے ساتھ ان کی عمر کی مناسبت سے طرزِ عمل اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ چھوٹے بچوں کو محبت کے ساتھ چومنا والدین کے لئے بے حد ضروری ہے' کیونکہ محبت کے اس محسوس مظاہرے سے بچے کی نفسیاتی اور اخلاقی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے دل میں یہ شعور جاگتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کے نورِ نظر ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بھی ان افراد کے ساتھ محبت کرنا سیکھتے ہیں جو ان کی پرورش اور پرداخت میں حصہ لیتے ہیں[3] ان کے اس شعورِ محبت کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ ان کا معاشرہ' وطن اور پوری انسانیت اس شعورِ محبت کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

لیکن سنگ دلی اور تشدد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے ذہن میں نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ سختی کرنے والوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس نفرت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات پوری انسانیت اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت اقرع بن حابسؓ نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپؐ اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے ہیں۔ انہوں نے (تعجب سے) کہا کہ ''میرے دس لڑکے ہیں' میں نے ان میں سے کسی کو کبھی پیار نہیں کیا''۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ)) (متفق علیہ)

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا''۔

چھوٹے بچوں کی تربیت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ کبھی کبھی مہذب قسم کا ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی کی جائے۔ اس طرح ان کی شعوری اور ذہنی قوتوں کو جلا ملتی ہے' ان کے اندر خود اپنی شخصیت کا شعور اُبھرتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے ماحول میں ان کا بھی ایک مقام و مرتبہ ہے۔ اور اگر سن تمیز سے قبل بچوں سے کوئی ناپسندیدہ بات بھی ظاہر ہو تو اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک بار نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے جب آپ سجدہ میں گئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کھیلتے کھیلتے آئے اور آپؐ کی گردن مبارک پر آ کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے سجدہ کو اتنا طویل کیا کہ مقتدی فکرمند ہو گئے۔ نماز کے بعد حضور ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ میرا ''بیٹا'' میرے اوپر آ کر بیٹھ گیا تھا' مجھے یہ اچھا نہ لگا کہ میں اس کی مرضی کے بغیر اسے جلدی سے اتار دوں۔

حضور اکرم ﷺ کا اس نواسے کے ساتھ معاملہ دیکھئے جس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ نانا جان ربّ العالمین کی بارگاہ میں ہیں اور نماز کی امامت فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کو ڈانٹنا تو دُور کی بات ہے خود اُتارنا بھی پسند نہ فرمایا' بلکہ اُس وقت تک سجدہ کو طویل کیا جب تک حضرت حسینؓ خود نہ اُتر گئے۔ بچوں کے ساتھ والدین کا یہی طرزِ عمل ہونا چاہئے۔ البتہ بچہ جب سن تمیز کے مرحلے میں داخل ہو جائے تو اس کے سرپرست کو مناسب اور نامناسب باتوں میں فرق کرنے کی جانب اسے متوجہ کرتے رہنا چاہئے۔

فطری صلاحیتوں کا صحیح استعمال

بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے اسی طرح اس کی مخفی خواہشات نمایاں اور فطری قوتیں بیدار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہر ہر صلاحیت دراصل ایک دو دھاری تلوار ہے' چنانچہ اس کا صحیح استعمال اگر مفید ہے تو غلط استعمال نقصان دہ ہے۔

ملکیت اور تصرف کا جذبہ: بچے کی وہ خواہشات اور وہ جذبات جو بہت ابتدائی دَور میں ظاہر ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک جذبہ ملکیت اور تصرف بھی ہے۔ اس جذبہ کو صحیح رخ پر اس طرح ڈالنا چاہئے کہ بچہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے' ورنہ اندیشہ ہے کہ بچہ شریر اور دوسروں کے قبضے میں جو کچھ ہے اس کو ہر ظلم و تعدی سے ہتھیانے کا شائق بن کر نشوونما پائے گا۔

غذا کی طلب: غذا اور کھانے کی طلب بھی بچے کی ابتدائی خواہشوں میں سے ہے۔ بعض

بچوں میں یہ طلب فطری حد سے تجاوز کر کے ندیدے پن' عمدہ غذاؤں کی بے تابانہ تلاش اور کھانے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی مذموم عادتوں تک جا پہنچتی ہے۔ اگر اس فطری طلب کو کسی ضابطے اور نظم کے دائرے میں نہ لایا جائے تو وہ طرح طرح کی بدتمیزی اور بے ادبی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔

اس فطری خواہش کو ضوابط کا خوگر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اوّل تو بڑے خود بچے کے سامنے اچھا عملی نمونہ پیش کریں' پھر اسے بسم اللہ پڑھ کر اور داہنے ہاتھ سے کھانے کی تاکید کریں' اچھی طرح چبا کر کھانے کے فائدے سمجھا کر اس کا عادی بنائیں' اپنے سامنے سے کھانے کی تلقین کریں' کبھی کبھار معمولی اور موٹا جھوٹا کھانا بھی کھلائیں تاکہ وہ ان غذاؤں سے بھی آشنا رہے اور اگر خدانخواستہ کوئی برا وقت آ پڑے تو وہ معمولی غذاؤں سے بھی کام چلالے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچے کے تمام فطری مطالبات پر نگاہ رکھی جائے اور ابتداء ہی سے ان کا رُخ خیر کی طرف موڑ دیا جائے' تاکہ بچہ جوانی کے پُرخطر دَور میں داخل ہو تو سلامتِ طبع اور تربیت یافتہ رجحانات و جذبات سے آراستہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا بچہ جوانی کے طوفانی دَور میں ان برائیوں سے محفوظ رہے گا جن میں بالعموم وہ بچے مبتلا ہو جاتے ہیں جو تہذیب و تربیت سے محروم اور شتر بے مہار بن کر نشو و نما پاتے ہیں۔

ضروری آداب

بچے کو دوسروں کے سامنے تھوکنے اور ناک صاف کرنے سے منع کرنا چاہئے۔ مجلس میں مہذب طریقہ پر بیٹھنے کا انداز سکھانا چاہئے' مثلاً یہ کہ دوسروں کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنے سے منع کرنا چاہئے۔ بسیار گوئی اور بے معنیٰ گفتگو سے اُسے روکنا چاہئے۔ بچہ اس بات کا عادی ہو کہ وہ بڑوں کے درمیان کسی خاص ضرورت کے بغیر گفتگو کا آغاز خود نہ کرے' اپنے سے بڑوں کی بات غور سے سنے' آنے والے کے لئے خود اٹھ جائے اور مجلس میں اس کے لئے جگہ خالی کردے' اگر کہیں لغو یا بے ہودہ گفتگو سنے تو وہاں سے ٹل جائے۔

اپنے والدین اور تمام بڑوں کی عزت کرے خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اسی طرح اپنے اساتذہ اور قوم کے بزرگوں کا احترام کرے اور ان کی باتوں کی تقلید کرے' ان کے اچھے اخلاق اپنائے اور ان کی جو باتیں اچھی نہ ہوں ان سے دور رہے۔ نبی ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (ابو داؤد)

''جو کسی گروہ سے مشابہت کرتا ہے اس کو اسی گروہ میں سے سمجھنا چاہئے''۔

بچے کو اس امر کا بھی عادی بنایا جائے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا کسی طور سے بھی مظاہرہ نہ کرے' نہ مال کی زیادتی کا نہ عزت میں سبقت کا اور نہ ذہانت میں برتری کا۔

بچہ اپنے استاد کے مقابلے میں تکبر کا مظاہرہ نہ کرے' بلکہ استاد ہی نہیں دوسروں کے مقابلہ میں بھی تواضع سے پیش آئے۔ تواضع اور خاکساری برتنے کا سب سے اچھا اور سب سے بہتر مقام طلب علم ہے۔ حضرت معاذ بن جبل ﷺ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ''خوشامد اور چاپلوسی طلب علم کے سوا کسی اور موقع پر مؤمن کے اخلاق میں نہیں پائی جاتی''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

''میں نے طالب علمی کی ذلت گوارا کی تو میں نے مطلوب ہونے کی عزت حاصل کر لی''۔

کسی دانا کا قول ہے جو شخص گھڑی بھر کے لئے سیکھنے کی ذلت گوارا نہ کرے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جہالت کی ذلت میں گرفتار رہے گا۔ کسی ایرانی فلسفی نے کہا ہے کہ ''اگر تم بچپن میں اپنی پسند کی جگہ بیٹھو گے تو بڑے ہو کر تم کو ایسی جگہ بیٹھنا ہو گا جو تمہیں پسند نہ ہو گی''۔

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکے کو اپنے استاد کا احترام اور عزت کرنا سکھایا جائے۔ حضرت علی ﷺ کا ارشاد ہے کہ اہل علم کی فضیلت اہل علم ہی جانتے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے:

اِنَّ الْمُعَلِّمَ وَالطَّبِیْبَ کِلَاھُمَا
لَا یَنْصَحَانِ اِذَا ھُمَا لَمْ یُکْرَمَا
فَاصْبِرْ لِدَائِكَ اِنْ جَفَوْتَ طَبِیْبَهٗ
وَاصْبِرْ لِجَھْلِكَ اِنْ جَفَوْتَ مُعَلِّمًا

''استاد اور طبیب دونوں اسی وقت تمہاری خیر خواہی کر سکتے ہیں جب ان کی عزت کی جائے۔ اس لئے اگر تم نے معالج کے ساتھ زیادتی کی ہے تو تم کو اپنی بیماری کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر تم نے استاد کے ساتھ زیادتی کی ہے تو تمہیں جہالت کے کڑوے گھونٹ پینے پڑیں گے''۔

اگر آپ کا بچہ فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں سست ہو تو اس کے سبب پر غور کیا جائے۔ اگر اس کی یہ سستی فرائض یا ان کی اہمیت سے ناواقفیت کے باعث ہے تو اس کی ناواقفیت کو دور کرنا چاہئے۔ اگر محض سستی کی وجہ سے ہے تو اسے چست بنانے کی کوشش کرنا چاہئے اور اگر کسی ضد کی وجہ سے ہے تو اس کو سیدھا کرنے کے لئے حکمت سے کام لینا چاہئے۔ اس بارے میں بیزاری کا اظہار کرنا سخت نقصان دہ ہے۔ نصیحت کے لئے مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں رہنا چاہئے' ہمہ وقت نصیحت کرتے رہنے سے نفرت کے بڑھنے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ اگر بالکل ابتدائی دور میں بچے کی رہنمائی کی طرف توجہ دی جائے تو اس سے فائدہ حاصل ہونے کی زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔

بچے کے بالغ ہونے سے پہلے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنا چاہئے تاکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت نشوونما پائے۔ اسی طرح اس کے سامنے آخرت میں متقین کو حاصل ہونے والی نعمتوں اور نافرمانوں کے لئے مخصوص سزاؤں کا ذکر بھی کرتے رہنا چاہئے تاکہ ابتداء ہی میں خود اس کے نفس کے اندر برائی سے بچنے کا قوی جذبہ پیدا ہو جائے کیونکہ اگر وہ نیکی کی حالت میں بالغ ہوگا تو اس مبارک نشوونما سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ بھلائی کے نقوش اس کے نفس میں ایسے مستحکم ہوں گے جیسے پتھر سے کندہ کی ہوئی تحریر۔ اور اگر اس کو بلوغ سے پہلے صحیح رہنمائی سے محروم رکھا گیا تو پھر اس کا علاج بے حد دشوار ہوگا اور بعد کی تربیت و نصیحت اس کے لئے نقش بر آب سے زیادہ مفید ثابت نہ ہوگی۔

قرب بلوغ کے زمانے میں لڑکے کو جنس مخالف سے آزادانہ ملنے اور خلوت سے بچانے کی کوشش کی جائے' جنس مخالف کے یہ افراد خواہ اس کے رشتہ دار ہوں یا اجنبی' کیونکہ بچے کی زندگی میں یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے گزر کر بچہ یا تو عفت و پاکیزگی کی زندگی اختیار کرتا ہے یا انحراف اور بگاڑ کی۔ اس لئے والدین کو اس مرحلے میں پوری طرح چوکنا رہنا چاہئے۔

اگر اللہ تعالیٰ بچے کو حیا کی صفت عطا فرمادے تو وہ اس کے لئے کافی ہوگی۔ اس کو بے شمار برائیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھے گی اور اس کے والدین کے لئے ایسے بچے کی تربیت آسان ہو جائے گی۔ نیز قرب بلوغ کے طوفانی دور میں وہ بہت سی نامناسب باتوں سے دور رہے گا۔ نبی ﷺ نے حیا سے محروم ہونے کے نتائج بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

((اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ)) (رواہ البخاری و ابوداؤد)

''اگر تم میں حیا نہیں تو پھر تم جو جی چاہے کرتے پھرو۔''

مطلب یہ ہے کہ حیا سے محروم انسان کو بڑی سے بڑی برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی ذرا جھجک نہیں ہوتی اور جس شخص میں حیا ہوگی وہ تمام برائیوں سے بچتا رہے گا اور اس کا جھکاؤ اخلاق کی جانب ہوگا۔

''حیا'' کی صفت سے بھی اچھے نتائج حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی صحیح تربیت کی جائے' ورنہ اندیشہ ہے کہ بچہ ''حیا'' کا مطلب ہر کام میں پیچھے رہنا سمجھ بیٹھے گا۔

والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچے کو آرام طلب اور سہل پسند نہ بنائیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''سخت کوش بنو عیش و آرام کو دوام نہیں''۔ آرام طلب انسان کارزارِ حیات کے اندر نہ تو اپنی معاش کے لئے تگ و دو کر سکتا ہے اور نہ ہی ملک و ملت کے لئے کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

نیکی پر حوصلہ افزائی اور برائی کی پردہ پوشی

بچے سے جب کوئی نیکی یا بھلائی ظاہر ہو تو اس پر اس کی مناسب حوصلہ افزائی کرنی چاہئے اور اگر اس سے اتفاقاً کوئی برائی سرزد ہو جائے جس پر تنبیہ کرنا ضروری ہو تو تنہائی میں تنبیہ کی جائے۔ دوسروں کے سامنے اس کی برائی کا پردہ چاک نہ کیا جائے' ورنہ بچہ ڈھیٹ بن جائے گا۔ اس بچہ کو ہمہ وقت ملامت کرتے رہنا بھی ٹھیک نہیں' ورنہ وہ اس ملامت کا عادی ہو جائے گا اور اس کا کوئی اثر قبول نہ کرے گا یا الٹا ضد میں مبتلا ہو کر برائیوں کے ارتکاب میں زیادہ جری ہو جائے گا۔

اولاد کی تربیت میں ماں کو باپ کا معاون بننا چاہئے۔ اگر بچے غلطی کریں تو ماں ان کو اس غلطی سے باز رہنے کی تلقین کرے اور ان کو یہ خوف بھی دلائے کہ اگر وہ غلط کام سے باز نہ آئے تو والد تک بات پہنچ جائے گی۔ بچے کو اپنے رفقاء کے ساتھ تعاون کا عادی بنایا جائے اور یہ کہ اگر اس کے ساتھی مادی مدد کے محتاج ہوں تو وہ ان کی اس طرح مدد کرے کہ ان کی خودداری مجروح نہ ہو۔ بچے کو یہ بھی سکھایا جائے کہ اس کی نگاہ اپنے ہم چشموں کی چیزوں' لباس' کھانوں اور خرچ اخراجات پر نہ ہونی چاہئے۔ اگر بچہ گھر میں کبھی کوئی ایسی چیز لے آئے جو اس کے گھر والے جانتے ہیں کہ اس کی نہیں ہے تو وہ اسے لینے اور قبول کرنے سے انکار کر دیں اور اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ آئندہ اس قسم کا کام نہ کرے۔ اگر اسے مدرسے میں کوئی چیز پڑی ہوئی ملے تو وہ اسے ہیڈ ماسٹر کو پہنچا دے۔

بچے کو اپنے گھر والوں کے کام کرنے کی عادت ہونی چاہئے تاکہ وہ ان کا مددگار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا بنے۔ اسی طرح اسے ورزش کا عادی بنایا جائے اور اسے دن کے بعض اوقات میں کھیل کی اجازت دی جائے' ورنہ کھیل اور ورزش سے اس کو روکنے اور ہمیشہ مطالعے پر مجبور کرنے سے بچے کی ذہانت ختم ہو جائے گی اور اس کے لئے زندگی اجیرن بن جائے گی۔ پھر وہ تنگ آ کر تعلیم سے نجات حاصل کرنے کے بہانے تلاش کرنے لگے گا۔ بچے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کریں' اس مقصد کے حصول میں والدین کو اپنی اولاد کی مدد کرنی چاہئے۔ چنانچہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

''اللہ اس والد پر مہربان ہو جو اپنے بچے کو باوفا بننے میں مدد دیتا ہے۔''

یعنی اپنے برے رویئے اور بری تربیت کی وجہ سے یا اس کے ساتھ بدزبانی یا امتیازی سلوک کر کے اس کو نافرمانی کی راہ پر نہ ڈال دے' بلکہ نیکی اور اچھی رہنمائی کے ذریعے اس کی تربیت کرے اور سب بھائیوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرے۔ جب بچہ بلوغت کی سرحد طے کر لے تو اس کے والد پر لازم ہے کہ وہ اس سے ایک ذمہ دار شریک کا سا معاملہ کرے' بچے کا سا معاملہ نہ کرے' ورنہ اس کی یہ استعداد ختم ہو جائے گی کہ وہ گھر میں ایک ایسے فرد کی حیثیت اختیار کرے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو اور نہ اس سے دشمن کا معاملہ کرے' ورنہ وہ بھی دشمنی پر اتر آئے گا۔ والد کے لئے مناسب ہے کہ وہ اس کی ایسی تمام ضروریات اور خواہشات پوری کر دے جو اس کے بس میں ہوں' بشرطیکہ اس رویہ سے اس کے مزید بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ ہر معاملہ میں ''میانہ روی'' سب سے بہتر طرزِ عمل ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کا خاتمہ کسی دانا کے اس قول پر کرتے ہیں:

''سات سال تک تیرا بچہ پھول ہے' اسے سونگھتا رہ ـــــ پھر دوسرے سات سال تک تیرا خدمت گزار ہے' اس سے خدمت لیتا رہ ـــــ اس کے بعد چاہے تو اسے اپنا دشمن بنا لے اور چاہے اپنا شریک معاون''۔

اب آپ سوچ لیں کہ آپ اپنے بچے کو چودہ سال کے بعد کیا بنانا چاہتے ہیں؟ دشمن یا معاون و مددگار؟

ماخوذ از عربی رسالہ ''الھدیٰ''

(شرق اردن)

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

اس ورکشاپ کا آغاز ۱۳ رمئی ۲۰۰۴ء کو قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس ۱۹۱۔اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں ہوا تا کہ میٹرک کے امتحانات سے فارغ طلبہ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس ورکشاپ میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوئی۔ تجوید و ناظرہ' مطالعہ قرآن' مطالعہ حدیث' تعارف ارکان اسلام و مسائل نماز' کمپیوٹر EDP' بنیادی انگلش گرامر پر خصوصی لیکچر۔

۹ جون ۲۰۰۴ء کو محترم انوار الحق چوہدری ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز' قرآن اکیڈمی نے اس کلاس سے خطاب فرمایا۔ موصوف کے خطاب کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

عزیز طلبہ!

مجھے خوشی ہے کہ اس کورس کے ختم ہونے سے پہلے مجھے آپ سے چند باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ کے والدین اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے آپ کو میٹرک کے امتحانات کے بعد فارغ وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس کورس میں داخل کروایا۔ اور آپ نے گرمی کے اس موسم میں محنت سے پڑھا اور قرآن حکیم' عربی گرامر' تجوید' نماز وغیرہ جیسے اہم امور سیکھے۔

اب آپ کے جانے سے پہلے میں دو تین ضروری باتیں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ دنیا کی یہ زندگی عارضی ہے۔ ہر کوئی جو یہاں پیدا ہوا ہے اس نے ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ آگے جا کر حساب کتاب ہونا ہے۔ نیک اعمال کی وجہ سے یا تو ابدی جنت ملے گی یا پھر دوزخ کی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ہمیں اس عارضی زندگی میں نیک اعمال کر کے جنت میں جانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت قرآن حکیم ہے۔ اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن مجید عربی میں نازل ہوا ہے اور عربی ہمیں آتی نہیں۔ اس لئے ہم قرآن مجید کو سمجھ نہیں سکتے' اور جب سمجھ نہیں سکتے تو اس پر عمل کیسے کریں گے؟ اس لئے ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید کا ترجمہ سیکھیں تا کہ اس پر عمل کر سکیں۔ انجمن خدام القرآن نے

طلبہ کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ سیکھنے کی غرض سے ایک آسان کورس ترتیب دیا ہے' جو کہ خط و کتابت کورسز کے ذریعے طلبہ و طالبات کو گھر بیٹھے کرایا جاتا ہے۔ جو طالب علم اردو پڑھ لکھ سکتا ہو وہ اس کورس کو آسانی سے کرسکتا ہے۔

اگر آپ دس پندرہ منٹ روزانہ اس کورس پر صرف کریں تو دس پندرہ دن میں آپ پورے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس کورس کے لئے نہ تو ٹیوٹر رکھنے کی اور نہ ہی گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہے۔ اس کورس میں حافظ نذر احمد صاحب کا ترجمہ follow کیا جاتا ہے اور امتحان پاس کرنے پر سند جاری کی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کورس سے آسان' سائنٹیفک اور سستا کوئی اور کورس نہیں ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اس کورس میں داخلہ کے لئے کوئی تاریخ مقرر نہیں' بلکہ یہ ایک open کورس ہے' آپ جب چاہیں اس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ میرا یہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ جو طالب علم بچپن میں قرآن مجید ناظرہ یا حفظ یاد کرتے ہیں یا اس کا ترجمہ سیکھتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ بڑے ہو کر قرآن مجید سیکھ لیں گے وہ کبھی نہیں سیکھ سکتے۔ اس لئے آپ اس موقع سے جلد از جلد فائدہ اٹھائیں۔

قرآن کالج: آپ نے ایک ماہ قرآن کالج میں جنرل نالج ورک شاپ اٹنڈ کی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کالج میں دینی اور دنیاوی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے جو اور کسی کالج میں نہیں دی جاتی۔ یہاں ہوسٹل کی سہولت بھی ہے اور ڈسپلن بھی معیاری ہے۔ شام کے اوقات میں ہوم ورک کلاس کا اہتمام بھی ہے۔ اس لئے آپ میٹرک کا نتیجہ نکلنے کے بعد اس کالج میں داخلہ لیں تاکہ دین اور دنیا کی کامیابی حاصل کرسکیں۔ اس کالج میں فیس بھی دوسرے پرائیویٹ کالجز کی نسبت کم ہے۔

ترجمہ قرآن کریم کورس شعبہ خط و کتابت کورسز قرآن اکیڈمی ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن سے کرایا جاتا ہے۔ وہاں پر اس شعبہ کا دفتر بھی ہے۔ میرا دفتر بھی وہیں ہے۔ پراسپکٹس پر فون نمبر بھی دیا گیا ہے۔ اگر آپ اس کورس کے بارے میں بعد میں مزید معلومات لینا چاہیں تو فون پر رابطہ کریں' کوئی مشورہ کرنا ہو یا قرآن کے بارے میں کوئی information چاہئے ہو تو مجھ سے ذاتی طور پر دفتر کے اوقات میں ملیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو اور آپ کو زندگی میں کامیابی عطا فرمائے۔

آخر میں شرکائے کلاس میں ترجمہ قرآن کریم کورس کے پراسپکٹس اور داخلہ فارم تقسیم کئے گئے۔ oo

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : الفرقان (تفسیر سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرۃ)

مرتب : شیخ عمر فاروق

ضخامت: 704 صفحات (30x20/8)..... قیمت : درج نہیں

ملنے کا پتہ: جامعہ تدبر القرآن 15-بی وحدت کالونی لاہور

شیخ عمر فاروق فضیلت علمی سے مالا مال سادہ شخصیت کے مالک ہیں۔ انگریزی اور عربی زبان میں مہارت رکھتے ہیں۔ درس وتدریس میں مصروف زندگی گزاری ہے۔ دین اور دینی علوم کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اُمت کی موجودہ حالت پر نہایت غمزدہ اور پریشان رہتے ہیں۔ اسی صورت حال کا اثر ہے کہ قرآن کے پیغام کو عام کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ بہت سی قدیم وجدید تفاسیر کا مطالعہ کیا اور حاصلِ مطالعہ کو جامع انداز میں مرتب کر دیا۔

قرآن پاک کی تفہیم کا سلسلہ انہوں نے درس کی شکل میں شروع کیا۔ یہ دروس ہفت روزہ ایشیا میں شائع ہوتے رہے۔ اب سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کے دروس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ شیخ صاحب کا اندازِ تفسیر منفرد ہے۔ وہ عربی اَسماء وافعال کی تشریح کرتے ہیں۔ پھر آیات کا بامحاورہ ترجمہ لکھتے ہیں۔ تفسیر بیان کرتے وقت معروف تفاسیر سے اقتباس نقل کرتے ہیں۔ اس طرح پڑھنے والا بیک وقت کئی تفاسیر سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ آخر میں آیات کی حکمت وبصیرت کے عنوان سے خلاصۂ مطلب بیان کرتے ہیں جس سے دورِ حاضر کے مسائل کے حل میں قرآنی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

یہ کتاب قرآن کا درس دینے والوں کے لئے بیش قیمت تحفہ اور فہم قرآن کے متلاشیوں کے لئے گوہر مقصود ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف تعصب' تنگ نظری اور فرقہ واریت سے بالاتر فکر ونظر کے مالک ہیں اور قرآن کو قرآن وسنت' حدیث اور تعامل صحابہؓ سے سمجھنے میں ہی عافیت خیال کرتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ابتدائی عربی گرامر نہایت سادہ آسان

مگر ماہرانہ انداز میں لکھ دی ہے۔عربی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق رکھنے والوں کے لئے یہ ایک مفید پیشکش ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے تمام اخراجات مصنف نے خود برداشت کئے ہیں اور اب وہ اسے ضرورت مندوں میں ہدیتاً تقسیم کررہے ہیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور توشۂ آخرت بنائے۔کتاب کی کمپوزنگ معیاری اور کاغذ عمدہ ہے۔جلد خوبصورت اور مضبوط ہے۔

(۲)

نام کتاب : شرح شمائل ترمذی جلد دوم

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت:582 صفحات ..... قیمت :درج نہیں

ملنے کا پتہ: القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد نوشہرہ

شمائل ترمذی حدیث کی معروف کتاب ہے' جس میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے معمولات بیان کئے گئے ہیں۔ہر مسلمان کی یہ خواہش ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ کی عاداتِ شریفہ اور پسند و ناپسند کا علم ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا اور اس کی بہت سی شروح لکھی گئیں۔زیرِ تبصرہ کتاب شرح شمائل ترمذی کی دوسری جلد ہے۔اس کے مصنف تجربہ کار مدرس اور ہر دلعزیز عالمِ دین ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حسنِ تحقیق اور تصنیف و تالیف کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

شرح شمائل ترمذی جلد دوم ۱۲۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ہر باب رسول اللہ ﷺ کے سیرت و کردار کے کسی ایک پہلو کے متعلق احادیث کی تشریح پر مشتمل ہے۔اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ تدریس کے انداز میں لکھی گئی ہے جو عام قارئین کے لئے معلومات فراہم کرتی ہے اور دین کے طالب علموں کے لئے استاد کا کام دیتی ہے۔ہر حدیث کے راویوں کے مختصر حالات' مشکل الفاظ کے معانی و مطالب اور پھر حدیث کا بامحاورہ ترجمہ تفہیم کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے۔اس کتاب کا مطالعہ پڑھنے والے کے دل میں مسنون اعمال کو اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرے گا جس سے حسنِ عمل کی توفیق عاقبت کی بھلائی پر منتج ہوگی۔

کتاب معنوی خوبیوں کے علاوہ حسنِ ظاہری سے بھی مزین ہے۔ٹائٹل خوبصورت اور جلد مضبوط ہے۔

رفقاء واحباب جانتے ہیں کہ

محترم ڈاکٹر اسرار احمد

کا مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

تحریک رجوع الی القرآن اور فریضہ اقامت دین کی انقلابی جدوجہد کے لئے بنیاد اور اساس کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس تحریکی و انقلابی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے منتخب نصاب کا محض مطالعہ ہی نہیں درس و تدریس بھی ایک لازمی ضرورت ہے۔ الحمدللہ کہ

قرآن اکیڈمی کراچی نے

مدرسین اور معلمین کی سہولت کے لئے

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب

کے حصہ اول، دوم، سوم اور چہارم کے نکات برائے درس و تدریس

علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیئے ہیں —— ان نکات میں:

- متعلقہ آیات کا لفظی ترجمہ
- تمہیدی نکات
- نفس مضمون کی وضاحت
- تفسیری نکات
- موضوع سے متعلق قرآن حکیم کے دیگر مقامات سے آیات کے حوالہ جات اور احادیث نبویہ شامل ہیں۔

قیمت: حصہ اول: 60، حصہ دوم: 60، حصہ سوم: 80 اور حصہ چہارم: 100 روپے

حصہ اول کی ابتداء تعارفِ قرآن حکیم کے لئے تدریسی نکات سے ہوتی ہے۔ دس صفحات میں قرآن حکیم کے تعارف سے متعلق تمام مباحث کو بڑی خوبصورتی سے سمویا گیا ہے۔

ملنے کا پتہ: (۱) قرآن اکیڈمی، خیابان راحت درخشاں ڈیفنس فیز IV، کراچی

(۲) **مکتبہ خدام القرآن** 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور